عصری ادب
اور
سماجی رُجحانات
ڈاکٹر رؤف پاریکھ

عبداللہ غوری
مینجنگ ڈائریکٹر: حسنین سیالوی
بھٹی کتب پراجیکٹ
گروپ میں شامل ہونے کے لیے واٹس ایپ کیجیے
03478848884

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

عصری ادب اور سماجی رُجحانات

عصری ادب
اور
سماجی رُجحانات

ڈاکٹر رؤف پاریکھ
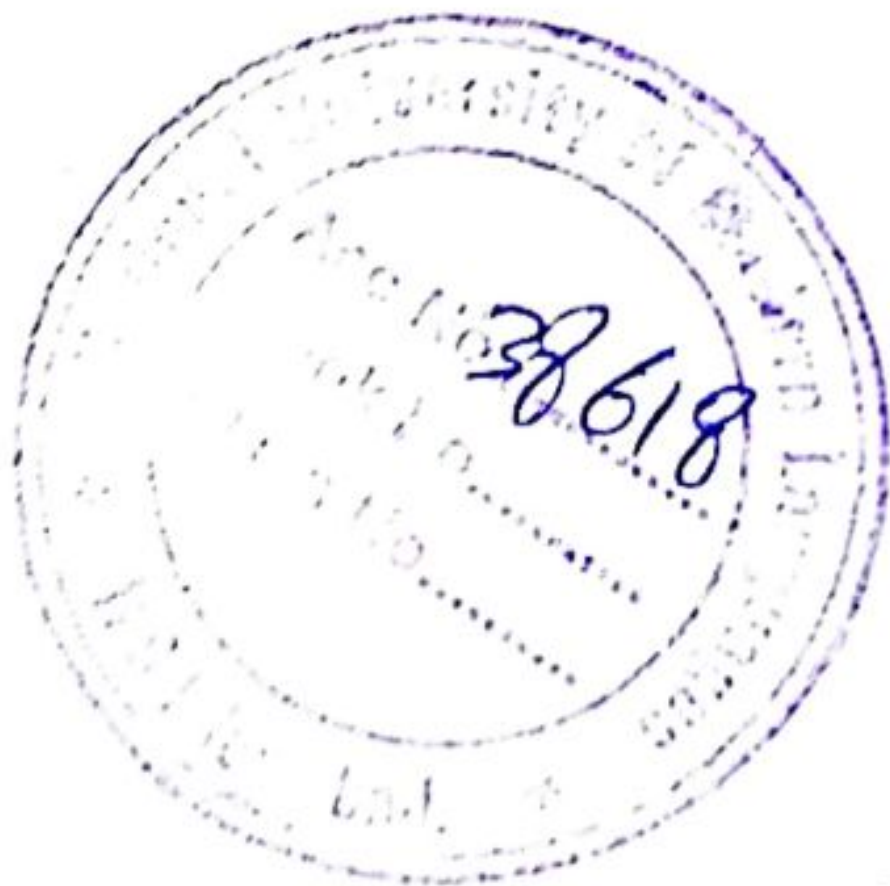
اکادمیِ بازیافت

عصری ادب اور سماجی رجحانات

Asri Adab Aur Samaji Rujhanat

(Contemporary Literature and Social Trends)

By : **Dr. Rauf Parekh**

پہلی اشاعت : نومبر ۲۰۰۳ء

ناشر : اکادمی بازیافت
کتاب مارکیٹ، آفس نمبر ۱۷، گلی نمبر ۳
اردو بازار، کراچی۔ فون: ۷۷۵۱۴۲۸

کمپوزنگ : لیزر پلس، اردو بازار، کراچی

قیمت : ۱۵۰ر روپے (پاکستان میں)
۱۲ر امریکی ڈالر (بیرونِ ملک)

بیگم کے نام

جنھوں نے گھر میں کثیر تعداد میں سوکنوں
یعنی کتابوں کو
برداشت کر کے فراخ دلی اور حوصلہ مندی
کا ثبوت دیا۔
(غالباً اس لیے کہ اس طرح کی سوکنوں
سے کچھ زیادہ خطرہ نہیں ہوتا۔)

فہرست

○○○

جن کا دیں پیرویِ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں اُن کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سرِّ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

(فیضؔ)

مقدمہ

یہ کتاب کتابوں کے بارے میں ہے۔ اس میں ہلکے پھلکے انداز میں بعض کتابوں کا تذکرہ ہے یا کتابوں سے متعلق باتیں ہیں۔ اس میں اگرچہ چند ایک نئی کتابوں کا بھی تذکرہ شامل ہے لیکن اصل مقصد کتابوں پر تبصرہ کرنا نہیں ہے بلکہ دراصل یہ ایک کوشش ہے کتابوں اور کتاب کلچر کو فروغ دینے کی۔

دراصل ہوا یوں کہ یارِ عزیز اجمل سراج نے، کہ شاعرِ طرح دار تو ہیں ہی یاروں کے یار بھی ہیں، ''جسارت'' کے ادبی صفحے کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد جہاں اہلِ قلم اور اہلِ علم کو اس صفحے کے لیے لکھنے کی دعوت دی، وہاں اس ہیچ مدان کو بھی شریکِ بزم کرنے پر اصرار کیا۔ چناں چہ اس صفحے پر ''کتابوں کی دنیا'' کا کالم شروع کیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ معیاری اور دلچسپ کتابوں کا ہلکے پھلکے انداز میں تعارف کرا دیا جائے۔ یہ گویا کتاب اور قاری کے درمیان بڑھتے فاصلوں کو کچھ کم کرنے کی مقدور بھر سعی تھی۔ کتابوں کی دنیا سے متعلق بعض مسائل اور کچھ سماجی رویے بھی اس کالم میں کبھی کبھی زیرِ بحث آئے، یا جب کوئی اچھی کتاب مطالعے میں آئی اور خیال آیا کہ قارئین تک اس کی اطلاع اور اس کا تعارف پہنچنا چاہیے تو اس پر کچھ لکھ دیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ دورانِ مطالعہ اپنے قارئین کو لطفِ مطالعہ میں شریک کرلیا۔ کتاب کا نیا ہونا ضروری نہ تھا، دلچسپ ہونا ضروری تھا۔ مذکورہ کتب میں سے بعض کتابیں سو سال یا اس سے بھی پہلے چھپی تھیں لیکن آج بھی قابلِ مطالعہ ہیں بلکہ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قافلہ کن کن منزلوں سے گزر کر آیا ہے۔

اسی طرح کئی کتابیں جو فٹ پاتھ سے خریدی گئیں، نہایت کار آمد اور دلچسپ ثابت ہوئیں اور جی چاہا کہ قارئین کو بھی اس نعمت میں سے کچھ حصہ ملنا چاہیے۔

چناں چہ ان کے چیدہ چیدہ نکات پیش کیے گئے۔ اسی طرح کتابوں، ان کی قیمتوں، ان کے حصول اور ان کے مطالعے کے بارے میں احساسات میں پڑھنے والوں کو شریک کرنے کا خیال بھی ان کالموں کا محرک تھا۔ گو قارئین کا ہمارے خیال یا رائے سے متفق نہ ہونا بھی ایک نیک شگون ہوگا (اس کی وضاحت کے لیے کتاب میں شامل تحریر ''ہماری سماجی صورتِ حال اور زوالِ مشرق'' ملاحظہ فرمائیے)۔ البتہ کتابی صورت میں لانے کے لیے بعض کالموں میں کچھ تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔

ممکن ہے کہ کوئی صاحب محسوس کریں کہ اس میں چند خاص قسم کی کتابیں یا مخصوص موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ یہ تاثر کسی حد تک درست ہوگا کیوں کہ اس کتاب میں جن کتابوں کے بارے میں بات کی گئی ہے وہ محض مصنف کے ذاتی میلان کی آئینہ دار ہیں، نہ کہ کسی مخصوص ادبی روایت یا رجحان کی۔ البتہ ان میں سے اکثر میں قدرِ مشترک ''لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد'' کا احساس ہے۔ اگرچہ یہ عین ممکن ہے کہ قارئین میں سے کئی نے زیرِ بحث کتاب ''پی'' بھی رکھی ہو لیکن اس صورت میں شاید وہ قندِ مکرّر کا مزہ بھی لے سکیں گے اور ہم خیالی اور ہم نشینی کا احساس اس پر مستزاد ہے۔ چند کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے بعض پہلوؤں سے ہمیں اختلاف تھا اور ہمیں اس کا حق تھا اور یہ حق ہم نے استعمال کیا ہے۔ ہم سے اختلاف کا یہ حق آپ کو بھی حاصل ہے۔

آخر میں ایک اہم بات! اگر اس کتاب میں شامل کوئی تحریر آپ کو غیر دلچسپ محسوس ہو تو ہمارے حصے کی صلواتیں بھی حضرتِ صابر وسیم مدظلہٗ العالی اور عزیزی اجمل سراج سلمہٗ کے کھاتے میں درج کر دیجیے گا بلکہ بذریعہ ڈاک براہِ راست ان حضرات کی خدمت میں ارسال فرما دیجیے گا کہ انھی کے اصرارِ پیہم کے نتیجے میں یہ سارے مضامین اس کتاب میں پائے جاتے ہیں۔

تو دانی حسابِ کم و بیش را

محمد عبدالرؤف پاریکھ

۱۴ / اگست ۲۰۰۲ء

ایک تقریبِ رونمائی بغیر کتاب کے

ہمارے ایک دوست جو بڑے افسر، درمیانے درجے کے نثر نگار اور چھوٹے شاعر تھے ہر سال ایک کتاب لکھا کرتے تھے۔ خیر کتاب لکھنا کوئی ایسی بڑی مہم نہیں جس کا ذکر کیا جائے۔ کیوں کہ کتاب تو آج کل ہر وہ کس نا کس لکھ سکتا ہے جس کی جیب میں کتاب چھپوانے کے پیسے ہوں۔ بلکہ بعض لکھنے والے تو پہلے ناشر یا پریس والے سے گفت و شنید کرتے ہیں اور بعد میں کتاب لکھنا شروع کرتے ہیں۔ بعض تو کتاب کی چھپائی کا کاغذ پہلے خرید لیتے ہیں اور مسودے کے لیے دستہ یا رِم خریدنے کی نوبت بعد میں آتی ہے۔ کیوں کہ کتاب چھپنے میں بسا اوقات برسوں لگ جاتے ہیں جب کہ اسے لکھنے میں مشکل سے چند روز لگتے ہیں کم از کم بعض شعراً کے مجموعے پڑھ کر تو یہی لگتا ہے بلکہ بعض اوقات تو شبہ ہوتا ہے کہ یہ چند گھنٹوں میں لکھے گئے ہیں۔ ہاں صاحب! آج اردو میں کتاب لکھنا جتنا آسان ہے اسے چھپوانا اتنا ہی مشکل ہے اور اسے پڑھوانا یعنی اس کے لیے قاری تلاش کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ شاید اسی مشکل کو حل کرنے کے لیے یار لوگوں نے تقریبِ رونمائی جیسی نادر ترکیب دریافت کی ہے۔ دریافت کیا کی ایجاد کی اور پھر اسے اتنی ترقی دی کہ اسے آرٹ بنا دیا۔ پھر اسے مزید ترقی دیتے گئے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ یہ آرٹ سے سائنس بن گئی۔ اب کوئی دن جاتے ہیں کہ اس کی ایجاد پر

سائنس کا نوبل انعام اردو ادب کے منافقوں... معاف کیجیے گا نقادوں کو دینے کا اعلان ہوگا اور اس اعلان کے بعد ایک تقریبِ پذیرائی ہوگی اور اس تقریبِ پذیرائی کی کامیابی کی خوشی میں پریس ریلیز جاری کرنے کے ساتھ ساتھ اظہارِ تشکر و مسرت کے لیے ایک اور تقریب منائی جائے گی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ تنبو قناتوں اور کرسیوں والوں کے کئی خاندان اردو والوں کی اس سخاوت وفیاضی کی وجہ سے پل رہے ہیں بلکہ لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ اردو کسی کا پیٹ نہیں پال سکتی؟

ہاں تو ذکر تھا ہمارے دوست کا جو ہر سال ایک کتاب لکھا کرتے تھے۔ لیکن کتاب لکھ لینا کوئی ایسے کمال کی بات نہیں۔ خاص طور پر اردو میں کتاب لکھنا تو ایسا ہی ہے جیسے چھینک مار لی یا انگڑائی لے لی۔ ان کاموں میں کوئی محنت نہیں کرنی پڑی، نہ ہی عقل خرچ کرنی پڑتی ہے، بس خود ہی پیش آجاتے ہیں۔ اصل کمال وہ حضرت یہ کرتے تھے کہ ہر سال ایک عدد تقریبِ رونمائی بھی منا ڈالتے تھے۔ اس تقریب کا مجلّہ چھپوانے پر انھیں کوئی ایک لاکھ روپے کی یافت اشتہاروں کی صورت ہوتی تھی۔ تقریب پر صرف بیس پچیس ہزار روپے خرچ ہوا کرتے تھے اور پبلسٹی مفت ملتی تھی۔ اسی ''تقریبِ منھ دکھائی'' کے زور پر وہ دو ایک دفعہ تو اسلام آباد بھی ہو آئے سرکاری خرچ پر۔ کیسے؟ ارے بھئی وہ دانشوروں اور اہلِ قلم کی کانفرنس جو ہوتی ہے وہاں۔ جسے بعض لوگ (نہ بلائے جانے پر جل کر) سالانہ میلۂ مویشیاں کا بھی نام دیتے ہیں۔ اب اگر کتاب لکھنے جیسا ''محنتِ شاقہ'' کا کام کرنے اور رونمائی جیسی تعلقاتِ عامہ کی زبردست مہارت کے بعد بھی اکادمی ادبیات والے وہاں نہ بلائیں تو خاک پڑے ایسی کتاب پر اور افسوس ہے ایسی اکادمی پر، اور تف ہے ایسے ادب اور ایسے ادیب پر۔

تعلقاتِ عامہ کے سہارے دور دراز کے لوگوں سے دوستیاں استوار کر رکھی تھیں۔ کرتے یہ تھے کہ جب اُنھیں ضرورت پڑتی تو اپنے ادارے کے اشتہار اُنھیں دلوا دیتے۔ نتیجہ یہ کہ جب اِنھیں ضرورت پڑتی، اور یہ ہر سال پڑا کرتی تھی، تو وہ ان کی اسی کرنسی میں مدد کیا کرتے تھے۔ کسی معروف شخصیت کو مہمانِ خصوصی بناتے تا کہ اس سے

مزید کام نکلوائے جاسکیں۔ بُرے وقت پر یعنی اکثر کوئی ڈھنگ کا مہمانِ خصوصی نہ ملنے پر کسی بڑے تاجر یا صنعتکار... کسی اسٹیل والے، ٹین ڈبے والے، چمڑے والے کو مہمانِ خصوصی بنا دیتے۔ اس میں فائدہ یہ رہتا ہے کہ پانچ ستاروں والے ہوٹل کا، جہاں تقریب ہوتی ہے، بل مہمانِ خصوصی خوشی خوشی اپنی جیب سے ادا کردیتا ہے۔

صرف اپنے حلقے کے ''تقریباتی نقادوں'' کو مضامین پڑھنے کی دعوت دیتے۔ جستہ جستہ لوگوں کو یادگاری مجلّے کے لیے مضامین یا تاثرات لکھنے کی بھی دعوت دی جاتی۔ جس میں طرفین کی سہولت کے خیال سے ایک پکی پکائی پرانی اور باسی رائے بھی لکھ کر بھیج دیتے تاکہ مکتوب الیہ اس پر بند آنکھوں اور کھلے دل سے دستخط کردے اور وہ زرّیں رائے مجلّے کا پیٹ بھر سکے۔ جن لوگوں نے زندگی بھر سوائے بہی کھاتوں اور قرض خواہوں کی فہرستوں کے کچھ نہیں لکھا ہوتا تھا وہ ضرور اپنی رائے سے نوازتے تھے اور لکھ بھیجتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں جو چند عظیم ترین کتابیں پڑھی ہیں آپ کی کتاب ان میں سے ایک ہے اور یہ بالکل سچ ہوتا تھا کہ ان بے چاروں کو زندگی میں کل دو تین کتابوں ہی کے مطالعے کا موقع ملا ہوتا تھا۔ لیکن مصنف کی مجبوری یہ تھی کہ جس ادارے سے اشتہار لینا ہوتا تھا اس کے افسروں سے وہ مضمون نہ لکھواتے تو ان کے نام مع تصاویر مجلّے کی زینت کیسے بنتے؟

مضامین پڑھنے والوں کی فہرست اتنی طویل ہوتی تھی کہ دعوتی کارڈ پر سطریں اور اسٹیج پر کرسیاں کم پڑ جاتی تھیں۔ البتہ ان کے تعلقات اسی تناسب سے وسعت پذیر ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا جب کارڈ کی پشت پر بھی فاضل مقررین اور مہمانانِ خصوصی و صدورِ مجلس کے اسمائے گرامی درج کرنے پڑے۔ (کاتب صاحب! یہ صدر نہیں صدور ہے وہاں واقعی ایک سے زیادہ صدر ہوتے تھے۔) تعلقات اتنے وسیع ہوگئے تھے کہ کسی ایک کو صدر بنا کر بقیہ کو ناراض کر کے مستقبل کی مستقل آمدنی کو خطرے میں نہیں ڈالا جاسکتا تھا۔ افسوس کہ کارڈ کی پشت کی طرح اسٹیج کی پشت کے استعمال پر کوئی بھی مہمانِ گرامی راضی نہ ہوا جس کی وجہ سے ہال میں اگلی نشستوں سے آگے

صوفے لگوانے پڑے تاکہ پچھلی نشستوں پر تشریف فرما بقیہ حاضرینِ محفل کو ان کی اوقات یاد دلانے میں آسانی ہو اور وہ فاضل مقررین اپنی خوش بختی اور علمیت پر پھولیں بھی تو صوفوں میں با آسانی سما سکیں۔

ہمارے انھی معصوم دوست جیسے لوگوں کے طفیل آج اس ملک پر وہ وقت آن پڑا ہے کہ ادبی تقریبات کی صدارت بلدیاتی اداروں کے کرتا دھرتا، کسٹم کے کلکٹر، صوبائی وزیرِ بے محکمہ اور بینکوں کے وائس پریذیڈنٹ کرتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ ان سرکاری اداروں کی کسی تقریب میں کسی اہلِ قلم کو بطورِ سامع بھی نہیں بلایا جاتا۔ ظاہر ہے یہ بے چارے "دو دو ٹکے کے" لکھنے والے ان سرکاری افسروں کے بھانجوں بھتیجوں کے لیے کر بھی کیا سکتے ہیں؟ البتہ ادبی تقریب کے اگلے روز یہ مدقوق اور فاقہ زدہ شعرا جب کسی سرکاری دفتر یا کسی بینک کے صدر دفتر پہنچتے ہیں تو گزشتہ روز کی تقریب کے سبب وہ "بڑے صاحب" کو یاد ہوتے ہیں اور ان شعرا کے چھوٹے موٹے کام وہ چٹکی بجاتے کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صدر یا مہمانِ خصوصی بننے کی اتنی سی فیس تو دینی ہی پڑتی ہے۔

تقریبِ رونمائی میں جھوٹ، منافقت، خوشامد اور ریا کاری کے عظیم مظاہرے کے بعد جب لوگ اپنے گھروں کو روانہ ہوتے ہیں تو ضمیر کے اس سوال کو کہ "آج اس تقریب میں اتنا وقت ضائع کر کے کیا پایا؟" عموماً سموسوں اور کیک کی ڈکار میں دبا لیتے ہیں۔

اگلے دن اخباروں میں خبریں آتی ہیں، تصویریں چھپتی ہیں، مقرر لوگ انھیں دیکھ کر مسکراتے ہیں اور پھر اگلے دن کی تقریب کی تیاری کرتے ہیں یعنی پچھلے دن کی تقریب کی تقریر نکالتے ہیں اور اس میں مصنف، کتاب اور مہمانِ خصوصی کے نام کو کاٹ کر نئی تقریب کے کارڈ کے مطابق کر لیتے ہیں۔ مصنف اسی طرح اتنا ہی عظیم رہتا ہے، شاعر اسی طرح غالب اور میر کو ٹھینگا دکھاتا رہتا ہے، مہمانِ خصوصی اتنا ہی عزت مآب رہتا ہے اور غیرت اور شائستگی اسی طرح منھ چھپائے روتے رہتے ہیں۔

تو کیا خیال ہے ہو جائے ایک تقریب رونمائی آپ کی کتاب کی؟ اعلان داغ

دیا جائے؟ کیا کہا کتاب؟ ارے صاحب کتاب تو بعد میں بھی لکھی جا سکتی ہے۔ پہلے اشتہار تو جمع کرنے شروع کر دیں اور ہال بھی بک کرالیں۔ پھر مشکل سے ملے گا۔ ہاں مہمانِ خصوصی کے لیے ''واٹر اینڈ گٹر بورڈ'' کے چیئرمین کا نام لکھ لیجیے۔ نہ نہ اسے دعوت ابھی نہیں دینی۔ اگر اس کا تبادلہ ہوگیا تو مسئلہ ہوگا، بس اُس وقت جو چیئرمین ہوگا اسے بلالیں گے۔ ارے ہاں اگر وقت ملے تو یہ بھی سوچ لیجیے گا کہ کتاب میں ہوگا کیا؟ اور اگر وقت نہ ملے تو بغیر سوچے سمجھے ہی سہی۔ بلکہ بغیر کتاب کے ہی سہی۔ اصل چیز تو تقریبِ رونمائی ہے۔ کتاب کا کیا ہے۔ ہوئی نہ ہوئی۔

○○○

کتاب مفت پانے والے خوش نصیب

کتابوں کے معاملے میں کچھ لوگ ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ کتابیں دُور دُور سے خود ہی کھنچ کر ان تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور کچھ بے چارے جیب میں ڈالے پیسے، پھرتے ہیں مارے مارے لیکن کتاب یا تو بازار میں دستیاب ہی نہیں ہوتی یا پھر اس کی قیمت ان کی رسائی سے بہت باہر ہوتی ہے۔ ہمارا شمار انہی بے چاروں میں ہوتا ہے۔ رہے وہ خوش نصیب جن کے پاس کتابیں خود بخود پہنچ جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات وہ ان سے جان چھڑانے کی بھی کوشش کرتے ہیں (کسی نو آموز شاعر کا مجموعہ ''عطا'' ہونے پر بالعموم یہ ہوتا ہے) تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس کتابیں پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی کیوں کہ یہ یا تو بڑے سرکاری افسر ہوتے ہیں یا نقاد اور تبصرہ نگار۔ ظاہر ہے کہ اب اگر نقاد اور افسر کتابیں پڑھنے بیٹھ گئے تو ''حکم'' کون لگائے گا؟ اس قسم کے لوگوں نے ایک فارمولا بنا رکھا ہے، وہ یہ کہ کتاب کس کی ہے؟ اگر مصنف کوئی سائل، یکے از مظلوم عوام یا دوست ہو تو کتاب پر نظرِ کرم ہوجاتی ہے۔ افسر اس کا کام کر دیتا ہے اور نقاد ایک عدد دوستانہ تبصرہ گھسیٹ دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں صاحبِ کتاب اس کتاب کو آئندہ ایسے نازک موقعوں کے لیے بطورِ تعارفی رقعہ یا ''وزیٹنگ کارڈ'' استعمال کرتا ہے اور ہر دفتر، ہر جلسے، ہر مشاعرے اور تقریبِ ریا کاری معاف کیجیے گا تقریب رونمائی میں بغل میں دابے

پھرتا ہے اور ''مان کہ نہ مان میں تیرا مہمان'' کے مصداق جوتوں اور کتاب سمیت آنکھوں میں گھسا چلا آتا ہے، حالاں کہ دونوں ناپاک ہوتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تینوں۔

بصورتِ دیگر یعنی مصنف کے نا آشنا یا بدتمیز (اس سے مراد یہ ہے کہ ملنے پر سلام کرنے میں پہل نہیں کرتا، اور ہم جواباً بڑی مربیانہ مسکراہٹ نچھاور کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں) ہونے پر ایک شاہی عتاب نازل ہوتا ہے۔ افسر تو خیر ایسی کتابوں کو کونے کھدرے میں ڈال کر غصہ ٹھنڈا کر لیتے ہیں لیکن مسئلہ بے چارے نقاد یا مبصر کے لیے ہوتا ہے۔ بالخصوص اگر مصنف کا ذرا سا بھی تعلق مخالف گروپ سے ''محسوس'' ہو جائے تو اس غریب نقاد کو اس وقت تک نیند نہیں آتی جب تک اس گستاخ مصنف کو کیفرِ کردار تک نہ پہنچا دیا جائے، یعنی بالفاظِ دیگر اس پر ایک عدد گرما گرم، دھواں اڑاتا تبصرہ ان جریدوں میں سے کسی ایک میں شائع نہ کرا دیا جائے جو اپنے ہی گروپ کے کسی ''ایجنٹ'' نے ایسے ہی نازک موقعوں کے لیے نکال رکھے ہیں۔ اور شاعر اور ادیب بننے کے شوقین نوجوانوں کے تعاون سے ایسے پرچے ملک کے ہر صوبے کے ہر اس شہر سے نکل رہے ہیں جس کی آبادی میں پڑھے لکھوں کی تعداد ڈھائی پونے تین سے تجاوز کر گئی ہے۔ (آخر پروف ریڈنگ کے لیے ایک اور پڑھا لکھا، بلکہ صرف پڑھا ہوا آدمی بھی تو ہونا چاہیے اس شہر میں، اور آدھا پونا قاری بھی)۔

ہمارے ایک ''مُدبّر'' دوست نے ایک ایسے حضرت سے بھی ہمارا تعارف کرایا تھا جو تھے تو بہت بڑے افسر لیکن کتابیں خریدا کرتے تھے اور وہ بھی بنڈلوں کے حساب سے، چوں کہ کسٹم میں افسر تھے لہٰذا رقم کی فراہمی کوئی مسئلہ نہ تھی کیوں کہ نوٹ چھاپنے کی مشین حکومت نے انھیں کسٹم میں عہدے کی صورت میں دے رکھی تھی۔ کراچی میں صدر میں چھٹی والے دن فٹ پاتھ پر لگنے والے ''کتابوں کے جمعہ بازار'' میں تشریف لے جاتے اور بنڈل کے بنڈل بندھوا کر گھر لے جاتے۔ سنا تھا کہ تیس ہزار، نصف جس کے پندرہ ہزار ہوتے ہیں، کتابوں کے مالک تھے۔ صرف مالک ہی تھے یا قاری بھی تھے اس سلسلے میں کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ اشتیاق کے مارے ہم نے ان کا کتب خانہ

دیکھنے کی درخواست کی تھی۔ ہامی تو بھرلی لیکن عین وقت پر غچہ دے گئے۔ شاید ڈر گئے ہوں گے کہ یہ کوئی کتاب دبا کر کہیں سٹک نہ لے۔ اگرچہ یہ کارِ ثواب کرنے کا ہمارا ارادہ تو نہ تھا لیکن انگریزی کی ایک کہاوت انھیں یاد آگئی ہوگی:

easy come easy go.

بات ہو رہی تھی ان خوش نصیب افراد کی جن کے پاس کتابیں خودبخود کچے دھاگے سے بندھی چلی آتی ہیں۔ افسر موصوف کا ذکر اس لیے آگیا کہ کتابیں ان کے پاس واقعی خود بخود چلی آتی تھیں۔ اور وہ ایسے کہ پرانی کتابوں کا کاروبار کرنے والے کتاب اس وقت تک کسی گاہک کو نہیں بیچتے تھے جب تک ان کو نہ دکھالیں۔ نوٹ چھاپنے کی مشین سے نوٹ چھاپتے اور چھٹی والے روز کتابیں گاڑی میں لاد کر شاداں و فرحاں چلتے تو ہم ایسے احمق حسرت اور حیرت سے تکا کرتے۔ دام جیب ہی میں رہ جاتے اور کتاب کسی اور کی الماری کی زینت بن جاتی۔ اس وقت ہمیں وہ ساری فلمیں یاد آجاتی تھیں جن میں غریب ہیرو کی محبوبہ کو امیر ولن اپنی دولت کے بل بوتے پر دُلہن بنا کر لے جاتا تھا اور ہیرو کچھ نہ کرسکتا سوائے اس گانے پر ہونٹ ہلانے کے جو کسی اور نے لکھا ہوتا اور کسی تیسرے نے گایا ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی تماشائی آنسو پونچھتے اور گنڈیریاں چوستے سنیما ہال سے نکلتے اور ولن کو وہ ساری گالیاں دے ڈالتے جو انھوں نے اچھے وقتوں یعنی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران سیکھی ہوتی تھیں۔ خود ہم نے تمام پیچیدہ قسم کی گالیاں اسکول میں داخل ہونے کے تین مہینے کے اندر اندر سیکھ لی تھیں۔ جنسیات کے ابتدائی اسباق ہم تک انھی گالیوں کی صورت میں پہنچے تھے۔ کون کہتا ہے کہ ہمارے اسکولوں میں "سیکس ایجوکیشن" کا انتظام نہیں ہوتا؟

ہمارے بعض دوست ایسے ہیں کہ یا تو بڑے افسر ہیں یا نقاد، یعنی کتابیں ان تک خودبخود پہنچ جایا کرتی ہیں اور وہ ہم ایسے لوگوں کو دے ڈالتے ہیں اور ہم ایسے لوگ سوچتے رہتے ہیں کہ یہ مصنف لوگ ہم ایسوں کو کتابیں دینے کی بجائے انھیں کیوں دے ڈالتے ہیں جن کے پاس پڑھنے کا بھی وقت نہیں۔ مثلاً اپنے ایک دوست کے پاس ہم

نے کئی ایسی کتابیں دیکھی جن پر مصنف کے دستخط مع تاریخ ثبت ہیں اور تاریخ سال بھر پرانی ہے۔ یعنی موصوف ایک سال سے کتاب رکھے بیٹھے ہیں اور تبصرے کی نوبت تو کیا مطالعے کا بھی وقت نہیں۔

ہم نے ایک دن جل کر کہا کہ کتابوں پر سانپ کیوں بنے بیٹھے ہو؟ اور یہ لوگ کتابیں تمھیں ہی کیوں بھجواتے ہیں۔ ہمیں کیوں نہیں دیتا کوئی؟ اس پر انھوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور یہ اہم اطلاع ہم تک پہنچائی کہ جس قسم کے مخالفانہ اور مخاصمانہ تبصرے آپ اور مبین مرزا کیا کرتے ہیں، اس کے بعد تو بہت سے لوگ سوچ رہے ہیں کہ آپ حضرات کو کتاب مفت میں دینا تو درکنار، آپ کے کتاب خریدنے پر بھی پابندی عائد کردی جائے۔

○○○

ایک دلچسپ کتاب

فہرست سازی ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ آپ چاہیں تو مختلف اقسام کی فہرستیں تیار کر سکتے ہیں۔ مثلاً دنیا کے مشہور اقوال کی فہرست، ناشرین کے مسترد کردہ ان مسودوں کی فہرست جو بعد میں شائع ہوکر ادبی شہکار قرار پائے، ان فوجی جرنیلوں کی فہرست جنھوں نے زندگی بھر کبھی کوئی جنگ نہیں جیتی۔ غرض کہ ان فہرستوں کی بھی ایک طویل فہرست بنائی جاسکتی ہے۔ لیکن ان فہرستوں کے لیے درکار معلومات حاصل کرنا کارِ دارد ہے۔ البتہ مغرب کے ناشرین نے ایسی دلچسپ اور عجیب و غریب فہرستوں پر مبنی کتابیں شائع کر دی ہیں۔

فہرستوں پر مبنی ان کتب کو عموماً ''بک اوف لسٹس'' (Book of Lists) کہا جاتا ہے۔ مختلف ناشرین نے اپنی اپنی دلچسپ فہرستوں پر مبنی کتابیں چھاپی ہیں۔ کچھ عرصے قبل ہم نے صدر کراچی کے فٹ پاتھ سے دس روپے میں ایک ایسی ہی کتاب خریدی ہے۔ اس کا نام ''بک اوف لسٹس۔۲'' ہے۔ یعنی یہ اس سلسلے کی دوسری کتاب ہے۔ اس کتاب پر ''ساسی بک اسٹور'' کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ہائے ہائے! یہ کس کا نام زبان پر آگیا۔ یادش بخیر صدر میں زیب النساء اسٹریٹ پر کتابوں کی ایک چار منزلہ دکان ہوا کرتی تھی۔ اس کی چاروں منزلوں پر کتابیں اٹا اٹ بھری ہوئی تھیں۔ کتابوں کی یہ

خوب صورت اور روشن دکان کیا ہوئی؟ اس کا وہی حشر ہوا جو ایک زر پرست اور علم دشمن معاشرے میں ہوسکتا ہے۔ یعنی یہ بند ہوگئی۔ اخباروں میں یہ تو بہت پڑھتے ہیں کہ کراچی میں اور ملک کے دوسرے شہروں میں سینما گھر بند ہو رہے ہیں، ٹوٹ رہے ہیں، لیکن افسوس کہ کتابوں کی ایسی ایسی دکانیں بند ہوگئیں اور کسی نے ایک لفظ نہ کہا۔

خیر! اس قصے کو اب جانے دیجیے۔ بات ساسی بک اسٹور سے شروع ہوئی تھی۔ اسے بھی جانے دیجیے۔ اور آیئے کتاب کی سیر کیجیے۔ کتاب میں شامل عجیب و غریب اور دلچسپ فہرستیں تقریباً ڈیڑھ سو (۱۵۰) مختلف افراد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ فہرستیں مختلف اوقات میں مختلف کتب و جرائد میں چھپی تھیں۔ تقریباً سترہ (۱۷) مدیروں، نائب مدیروں اور محققوں کی ایک ٹیم نے ان فہرستوں کو تلاش کیا اور چھان پھٹک کر اسے کتابی شکل دی اور یہ شکل پانچ سو زیادہ صفحات پر محیط ہے۔ ایک اشاریہ یعنی انڈیکس اس پر مستزاد ہے کہ آپ جس عنوان یا موضوع کے تحت چاہیں کوئی اندراج تلاش کرلیں۔

اس کتاب میں یوں تو ایسے اندراجات بے شمار ہیں جن سے ہم لطف اندوز ہوئے اور چاہیں گے کہ آپ بھی ان سے محظوظ ہوں لیکن ظاہر ہے کہ اتنی ضخیم کتاب سے بہت کچھ لینے کے بعد بھی بہت کچھ بچ جائے گا۔ مشتے نمونہ ازخروارے۔

☆ ایسے لوگوں کی فہرست جنھوں نے اپنی سالگرہ کا دن بدل ڈالا: اس فہرست میں بارہ مشہور افراد شامل ہیں جن میں ایک معروف اداکار ہمفرے بوگارٹ بھی ہے۔ فلم سازوں نے اس کی تاریخ پیدائش ۲۳ر جنوری سے بدل کر ۲۵ر دسمبر کردی تھی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح اس اداکار کے گرد رومانی ہالہ کچھ اور وسیع ہوجائے گا۔ انگریزی کے معروف ادیب آسکر وائلڈ نے اپنا سال پیدائش ۱۸۵۴ء سے ۱۸۵۶ء کرلیا تھا اور مقصد اپنے آپ کو کم عمر ظاہر کرنا تھا۔ (کتاب کے مرتبین کو شاید اندازہ نہیں کہ اس قسم کی حرکتیں ہمارے ہاں کے سرکاری ملازمین کتنے بڑے پیانے پر کرتے ہیں۔ ان کا مقصد ریٹائرمنٹ سے بچنا ہوتا ہے۔)

زبان کی لغزش: ۱۹۷۵ء میں رونالڈ ریگن نے ''تیسری دنیا'' کے موضوع پر

خطاب کرتے ہوئے تیسری دنیا (Third World) کی بجائے تیسری جنگِ عظیم (Third World War) کے الفاظ ادا کیے اور کہا کہ امریکا اس سلسلے میں بہت کچھ کرسکتا ہے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے یہ غلطی نو مرتبہ دہرائی (بتایئے صاحب! اتنی ذرا سی بات پر ان کا نام زبان کی لغزشوں والی فہرست میں داخل کردیا گیا حالاں کہ ہمارے سیاست دان دن رات ہر قسم کی لغزشوں کا ارتکاب کرتے ہیں مگر ان کا نہ کسی فہرست میں آتا ہے نہ کسی ایف آئی آر میں)۔

اسی فہرست میں ایک صاحب کا وہ جملہ بھی دیا گیا ہے جو انھوں نے ۱۹۶۹ء میں نیویارک میں سیاہ فام ووٹروں سے خطاب کرتے ہوئے ان کا دل جیتنے کے لیے ادا کیا تھا۔ موصوف نے فرمایا تھا کہ ''میرا دل بھی آپ کے دل کی طرح سیاہ ہے۔''

☆ ان ستائیس افراد کی فہرست جنھیں آتش زدہ مکان سے نکالنا چاہیے: معروف امریکی مزاح نگار مارک ٹوین نے ان ستائیں افراد کی فہرست بنائی تھی جنھیں جلتے ہوئے مکان سے نکال لینا چاہیے۔ اس فہرست میں پہلے نمبر پر منگیتر ہے۔ چوبیسویں نمبر پر مالک مکان ہے۔ پچیسویں نمبر پر آگ بجھانے والے عملے کے افراد ہیں، چھبیسویں نمبر پر فرنیچر ہے اور آخری نمبر پر کون ہے؟ جی ہاں آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا: آپ کی بیگم کی اماں یعنی آپ کی ساس صاحبہ کو جلتے مکان سے سب آخر میں حتیٰ کہ فرنیچر کے بعد نکالنا چاہیے۔

☆ کولمبس سے پہلے امریکا دریافت کرنے والوں کی فہرست: عام طور پر کرسٹوفر کولمبس کے سر امریکا دریافت کرنے کا سہرا باندھا جاتا ہے۔ (ہماری دانست میں امریکا کی دریافت ایک جرم سے کم نہیں بلکہ ابن انشاء نے تو امریکا دریافت کرنے والے کے لیے سزا بھی تجویز کرنے کا کہا تھا) لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے بہت پہلے امریکا دریافت کرلیا گیا تھا۔ کتاب میں ایسے ''ممکنہ'' (جی ہاں ممکنہ) سولہ (۱۶) افراد کی فہرست دی گئی ہے جنھوں نے غالباً کولمبس سے پہلے ہی امریکا دریافت کرلیا تھا۔ ان افراد میں مالی کا مسلمان حکمران شاہ ابوبکر دوم بھی شامل ہے جس نے تیرہ سو گیارہ (۱۳۱۱ء)

میں یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

☆ ان اشیاء کی فہرست جو لفظ بن گئیں: بیسویں صدی کی بعض ایجادات ایسی ہیں جن کا تجارتی نام یا برانڈ نام (Brand Name) اتنا مشہور اور مقبول ہوگیا کہ وہ ایک باقاعدہ لفظ بن گیا اور لغات میں بھی جگہ پا گیا۔ ایسی اشیا میں سے چند کے نام یہ ہیں: اسپرین، سیلوفین، کورن فلیکس، کیروسین، نائلون، زپر۔

☆ ایسے افراد کی فہرست جو کھڑے کھڑے لکھتے تھے: ان عجیب لوگوں میں بڑے بڑے نام شامل ہیں جنھوں نے کھڑے کھڑے شاہکار تخلیق کردیے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان میں غیر معمولی صلاحیتیں تھیں اور وہ فوراً ہی کتاب لکھ ڈالتے تھے۔ یہاں ''کھڑے کھڑے'' کے الفاظ ہم نے محاورتاً استعمال نہیں کیے بلکہ درحقیقت یہ لوگ کھڑے ہو کر ہی لکھتے تھے اور اپنے سامنے ایک اونچی میز رکھ لیتے تھے۔ لوئی کیرول، ہیمنگ وے، ورجینیا وولف کے علاوہ امریکی صدر تھامس جیفرسن بھی کھڑے کھڑے لکھتا تھا۔

اپنے ادیبوں میں سے شفیق الرحمان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ کھڑے کھڑے لکھتے تھے۔ البتہ عصمت چغتائی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اوندھے منہ لیٹ کر لکھتی تھیں اور ساتھ ساتھ برف کے ڈلے چباتی جاتی تھیں (شاید تحریر کی حدت کو کم کرنے کے لیے)

☆ ایسے ادیبوں کی فہرست جو علاماتِ وقف استعمال نہیں کرتے تھے: کچھ ادیب ایسے بھی تھے جنھیں علاماتِ وقف یعنی ''کاما''، ''فل اسٹاپ'' وغیرہ استعمال کرنے سے الرجی تھی۔

ان میں سے سب سے عجیب ٹموتھی ڈیکسٹر (Timothy Dextor) نامی ایک صاحب تھے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی جس میں نہ تو کوئی ''کاما'' تھا اور نہ ہی ''فل اسٹاپ''، نہ ہی انھوں نے انگریزی کے اس قاعدے کا خیال رکھا تھا جس کے تحت ہر نیا جملہ ''بڑے'' حرف تہجی (Capital Letter) سے شروع ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کتاب ایک طویل جملے کی صورت میں تھی۔ ناشر نے انھیں خط لکھا کہ اس مسودے

میں نہ کاما ہے نہ "فل اسٹاپ"، نہ کوئی پیراگراف نہ بڑا حرف تہجی جس سے پتا چلے کہ نیا جملہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ موصوف نے تاؤ میں ایک کاغذ پر بے شمار کامے "کیپٹل لیٹرز" اور فل اسٹاپ ٹائپ کیے اور ناشر کو اس پیغام کے ساتھ وہ کاغذ بھجوا دیا کہ "جہاں جہاں ضرورت پڑے، کیپٹل لیٹرز کامے اور فل اسٹاپ اس کاغذ سے لے لیے جائیں۔"

OOO

کتابوں کی کتاب

خدا خوش رکھے فٹ پاتھ پر کتابیں بیچنے والوں کو، کبھی کبھی ان کے توسط سے کچھ ایسی کتابیں بھی ہاتھ آجاتی ہیں جو ویسے کہیں اور نظر آ بھی جائیں تو انھیں خریدنا ''فقط آرزو کی بات نہیں۔'' ان مہربانوں کے طفیل ہم جیسے غریب غربا بھی لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصے قبل ہم نے ایک کتاب ''دی بک آف لٹریری لسٹس'' (The Book of Literary Lists) فٹ پاتھ سے خریدی۔ لندن کے کسی ناشر سج وک اینڈ جیکسن نے چھاپی اور قیمت اس کی رکھی بارہ پونڈ اور مزید کچھ پنس۔ زرمبادلہ کے آج کل کے بھاؤ کے حساب سے ہزار روپے سمجھ لیجیے۔ ہم نے یہ کتاب خیر سے پچاس روپے میں خریدی۔ شاید اور سستی مل جاتی اگر ہم بھاؤ تاؤ میں داؤ دکھاتے۔

خیر پچاس میں بھی بری نہیں۔ دیکھنے میں جیسے نئی ہے۔ مجلد بھی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں چھپی ہے۔ خوب صورت انگریزی میں لکھی گئی اور دبیز کاغذ پر چھاپی گئی یہ کتاب کتابوں ہی سے متعلق ہے۔ اس میں کتابوں، ادیبوں، شاعروں اور ناشروں کے بارے میں دلچسپ اعداد و شمار، پرلطف واقعات، ناگفتہ بہ حالات اور حیرت انگیز حقائق بیان ہوئے ہیں۔ خدا جانے اس کتاب پر یا ناشر پر کیا افتاد پڑی تھی کہ یوں ردی کے بھاؤ پاکستان روانہ کردی گئی جہاں خواندگی کا تناسب دنیا میں چشم بددور تیسرے نمبر پر ہے،

لیکن اوپر سے نہیں... نیچے سے۔ بہرحال ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے۔

اس میں یوں تو کئی ایسی باتیں ہیں جو قارئین کی صرف معلومات میں اضافہ ہی نہیں کرتیں بلکہ تفننِ طبع کا سامان بھی لیے ہوئے ہیں، لیکن کچھ جستہ جستہ نکات:

☆ اس کتاب میں ایک فہرستِ کتب مع تبصرہ ہے جو ہمارے بہت سے نام نہاد نقادوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ انگریزی ادب کے پچاس شاہکاروں کے بارے میں ہے۔ کتاب کے مرتب نکولس پارسنز نے اس کتاب میں بڑی محنت سے کئی اقسام کی فہرستیں جمع کی ہیں لیکن تین نقادوں کی تیار کردہ یہ فہرستِ کتب مع تبصرہ انگریزی ادب کے پچاس ایسے شاہکاروں کے بارے میں ہے جن کے بغیر (بقولِ مرتبین) ہمارا گزارا ہوسکتا ہے۔ گویا یہ ایک طرح سے کلاسیکی ادبی شہ پاروں کے خلاف علمِ بغاوت ہے۔ ساتھ ساتھ ہر کتاب پر جو مختصر تبصرہ دیا گیا ہے وہ بجلی کی رو کے چار سو چالیس ووٹ کے جھٹکے سے کم نہیں ہے۔ اس فہرست کا نام ہے:

Fifty Works of English and American Literature
we could do without.

یعنی ''انگریزی اور امریکی ادب کی ایسی پچاس کتب جن کے بغیر ہمارا گزارا ہوسکتا ہے۔'' (یہاں ہم نے Work کا ترجمہ کتب کردیا ہے لیکن یہ ذرا وسیع مفہوم میں آتا ہے) ان میں سے سب کی تفصیل تو ممکن نہیں بس اتنا سن لیجیے کہ ان میں انگریزی ادب کے بڑے بڑے جغادری اور دھانسو قسم کے لکھنے والوں کی کتابیں اور بعض کلاسیکی کتابیں بھی شامل ہیں۔ مثلاً بن جانسن، جان بنین، ہنری فیلڈنگ، ولیم ورڈز ورتھ، والٹر ریلے، چارلس لیمب، چارلس ڈکنز، تھامس ہارڈی، ایچ جی ویلز، ڈی ایچ لارنس، ولیم فاکنر، ہیمنگ وے اور آلڈس ہکسلے جیسے جید نام بھی اس فہرست میں موجود ہیں۔ اور پھر ان پر ایسا تبصرہ جو ایک جملے میں ایک پرانے بت کو ڈھا دیتا ہے۔ مثلاً ٹی ایس ایلیٹ کا شمار بیسویں صدی کی معروف ترین ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ہمارے ادیب اور دانش ور ان کے جملوں کو آسمانی صحیفوں کے سے تقدس اور احترام کے ساتھ اپنی تحریر کی زینت بناتے ہیں۔ خاص طور پر ان کی نظم ''دی ویسٹ لینڈ'' (The Waste

Land) کی بڑی ''دہشت'' ہے۔ اپنی اسی نظم پر موصوف نے کچھ وضاحتی ''نوٹس'' بھی لکھے تھے جو Notes on the Waste Land کے نام سے چھپے۔ اس پر ذرا تبصرہ ملاحظہ ہو: ''کسی چہچہاتے پرندے سے یہ توقع کرنا غلط ہے کہ وہ کائنات کی سچائیاں بیان کردے گا۔ یہ غلطی اس وقت حماقت بن جاتی ہے جب وہ پرندہ خود ایسا کرنے کا دعویٰ کرنے لگے اور جب لوگ اس دعوے پر یقین بھی کرنے لگیں تو یہ بڑی شرم ناک بات ہے۔''

اصل میں اس فہرست کا مقصد کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کلاس روم میں دیے گئے ادبی تصورات پر حملہ کرنا ہے۔ یہ اس بھیڑ چال کے خلاف احتجاج ہے جس کے تحت ذاتی اور انفرادی رائے قائم کرنے کی بجائے پُرکھوں کی دانش کو جوں کا توں قبول کرلیا جاتا ہے۔

اصل میں انگریزی میں ایسی کتابوں کی کئی فہرستیں ملتی ہیں جن کا مقصد کلاسیکی ادب کے شاہکاروں کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ مبذول کرانا اور ادب کے طالب علموں کو اچھی کتابوں سے روشناس کرانا ہے۔ لیکن اس قسم کے رویے کے ساتھ ایک طرح کی جو ''مُدرّسانہ'' اور ''مربیانہ'' تنقید آتی ہے، یہ فہرست گویا اس کا بھی مضحکہ اڑاتی ہے۔

البتہ اردو میں ایسی کوئی فہرست (ایک آدھ کو چھوڑ کر) نہیں ملتی۔ کاش کوئی اہلِ ذوق اس طرف توجہ کرے اور اردو کے کلاسیکی اور عظیم شاہکاروں کا کم از کم تعارف ہی کرادے۔ حمید نسیم ایک ایسی کتاب پر کام کررہے تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد اب اس کا چھپنا شاید مشکل ہے۔

☆ مغربی معاشرے میں ''سنسان جزیرے پر زندگی'' کا تصور خاصا پرانا ہے۔ اس تصور کے تحت ہر شخص سے پوچھا جاتا ہے کہ اگر آپ کو کسی سنسان جزیرے پر بھیج دیا جائے تو آپ وہاں کیا کریں گے؟ وقت کیسے گزاریں گے؟ اصل میں یہ خیال بنیادی طور پر ڈینیئل ڈی فو کی کتاب ''رابن سن کروسو'' سے ماخوذ ہے۔ جس کا مرکزی کردار ایک جزیرے پر طویل عرصہ تنہا گزارتا ہے۔ بہرحال، اس خیال کے تحت ادیبوں اور

نقادوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ آپ کو اگر کسی سنسان اور ویران جزیرے پر بھیج دیا جائے تو آپ کون کون سی کتابیں اپنے ساتھ لے جانا پسند کریں گے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ کتابوں کے بارے میں کچھ لوگوں کی پسند کا اور ان کتابوں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس کتاب میں ایسی کئی فہرستیں شامل ہیں۔ کئی ادیبوں اور نقادوں نے اپنی رائے اور پسند کی وجوہات بیان کی ہیں۔ ان میں سے کئی نے مختصر جملوں کے کوزوں میں تنقید کے دریا بند کردیے ہیں لیکن ہمیں ذاتی طور پر جو فہرست پسند آئی وہ کچھ یوں ہے۔

سنسان جزیرے پر مجھے ان کتابوں کی ضرورت ہوگی:

۱۔ اچھی کشتی بنانے کے طریقے سکھانے والی رہنما کتاب۔

۲۔ گہرے سمندروں میں کشتی چلانے کے طریقے سکھانے والی رہنما کتاب۔

۳۔ امدادی ٹیموں کو متوجہ کرنے کے طریقے بتانے والی رہنما کتاب۔

۴۔ ایسے کھانے پکانے کی ترکیبوں کی کتاب جن میں چولھا وغیرہ درکار نہ ہو۔

۵۔ درختوں کے پتوں سے کپڑے تیار کرنے کے طریقے سکھانے والی کتاب۔

گویا ''عظیم'' کتابوں کی بجائے ''عملی'' کتاب کی زیادہ اہمیت ہے۔

☆ اب تک تو ہمارا خیال تھا کہ صرف وطنِ عزیز کے پبلشر ایک عجیب وغریب کردار ہیں لیکن اس کتاب سے پتا چلا کہ یہ مخلوق ہر جگہ یکساں طور پر ٹھس ہے۔ مثال کے طور پر جیمز جوائس کی کتاب ''ڈبلنرز'' (Dubliner) کو لیجیے۔ جوائس کا شمار اب تو عالمی ادب کے بڑے ناموں میں ہوتا ہے لیکن اس کتاب کو ایک نہ دو پورے بائیس پبلشروں نے چھاپنے سے انکار کردیا تھا۔ جوائس کے ایک اور شاہکار ''اے پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایزاے ینگ مین (A Portrait of the Artist as a Young Man) کو بیس ناشرین نے مسترد کردیا تھا جس کا اس پر اثر اتنا بُرا ہوا کہ اس نے دل برداشتہ ہو کر مسودے کو آگ میں جھونک دیا تھا۔ عین اسی وقت اس کی بیوی پہنچ گئی اور اس نے مسودہ جلنے سے بچالیا۔ سبحان اللہ! لکھنے والوں کی بیویاں ایسی بھی ہوتی ہیں؟ ورنہ بالعموم تو یہ ایک نک چڑھے نقاد کی طرح شوہر کے کاغذات کو جلائے جانے ہی کے

قابلِ خیال کرتی ہیں۔

ویسے ہمارا خیال ہے کہ جوائس صاحب کچھ زیادہ ہی جلدی ہمت ہار گئے۔ انھیں چاہیے تھا کہ جون کریزی صاحب کی طرف دیکھتے جن کی پہلی کتاب کو ایک نہ دو پورے سات سو تینتالیس (۷۴۳) ناشرین نے ہری جھنڈی دکھائی تھی۔ لیکن جب ان کی پہلی کتاب چھپ گئی اور انھیں باقاعدہ ادیب تسلیم کرلیا گیا تو انھوں نے بھی خوب خوب انتقام لیا یعنی کتابوں کے ڈھیر لگادیے۔ موصوف نے کل پانچ سو پینسٹھ (۵۶۵) کتابیں لکھیں۔ (اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض لکھنے والوں کے مسودے رد کر کے کبھی کبھی ناشرین بھی انسانیت کی بڑی خدمت کر جاتے ہیں۔)

☆ اور اب کچھ ذکر Prison Literature یعنی جیساتی ادب کا۔ دنیا کی ادبی تاریخ میں جیل خانوں کا کردار بہت اہم ہے کیوں کہ قید خانوں میں بعض بڑے ادبی شہ پارے تخلیق ہوئے ہیں۔ (اگر ایسی ہی بات ہے تو تمام شاعروں اور ادیبوں کو ہمیشہ جیل ہی میں رکھنا چاہیے، تاکہ وہاں بیٹھے بیٹھے عظیم ادب تخلیق کرتے رہیں)

جیل میں لکھی گئی ان کتابوں میں سروانتے کی ''دون کی ہوتے'' (Don Quixote) جسے اکثر لوگ ''ڈون کوئیک زوٹ'' پڑھتے ہیں، سر والٹر ریلے کی ''ہسٹری اوف دی ورلڈ'' جان بنین کی ''پلگرمس پروگریس'' اور آسکر وائلڈ کی ''دا پروفنڈ'' بھی شامل ہیں۔

البتہ ان میں سر والٹر ریلے کی کتاب کا قصہ سب سے عجیب ہے۔ موصوف کو جب ٹاور اوف لندن میں گیارہ سال کے لیے قید کردیا گیا تو انھوں نے بعض ساتھیوں کی مدد سے دنیا کی تاریخ لکھنی شروع کی۔ لگ بھگ تین لاکھ الفاظ لکھے جانے کے بعد یہ تاریخ ایک سو تیس سال قبل مسیح تک کے حالات کا احاطہ کرسکی اور یہ مسودہ بھی ہاتھ سے تقریباً جاتا رہا تھا۔

ہوا یوں کہ ریلے صاحب ایک دن قید خانے کی کھڑکی سے سڑک کا نظارہ کررہے تھے کہ انھوں نے دو آدمیوں کو لڑتے اور بالآخر ان میں سے ایک کو قتل ہوتے دیکھا۔ فوراً ہی اس کے دو دوست اس سے ملنے آئے۔ انھوں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں

سے دیکھا تھا اور دونوں نے اس کی جو تفصیلات بتائیں ان میں فرق تھا۔ جب کہ خود ریلے کا نقطۂ نظر ان دونوں سے بھی مختلف تھا۔ غور کرنے پر ریلے کو احساس ہوا کہ جب چند منٹ پہلے ہونے والے واقعے سے متعلق حقائق کے بارے میں تین عینی شاہد تین مختلف آرا رکھتے ہیں تو صدیوں قبل پیش آنے والے واقعات کی تصدیق کون کرسکتا ہے؟ یہ سوچ کر اسے اتنا افسوس ہوا کہ اس کی کتاب کی وقعت اس کی نظر میں کچھ نہ رہی اور اس نے مسودے کو اٹھا کر ایک بڑے سے الاؤ میں پھینک دیا۔ اس کے دوستوں نے بڑی مشکل سے مسودے کو نکالا لیکن صرف دو جلدیں ہی ہاتھ آسکیں۔ باقی ساری محنت شعلوں نے چاٹ لی۔

☆ دل تو چاہتا ہے کہ اور بھی دل چسپ مواد آپ کے سامنے پیش کیا جائے لیکن افسوس یہاں کوئی الاؤ اور نقاد نما بیگم کے نہ ہونے کے باوجود اس تحریر کو اختتام سے ہم کنار کرنا پڑے گا۔ ہاں البتہ یہ اختتام الم ناک نہیں ہوگا۔

چلتے چلتے کتابوں سے متعلق کچھ ''اقوال'' بھی سن لیجیے جو بعض صورتوں میں واقعی ''زریں'' اور اسی ''کتابوں کی کتاب'' سے لیے گئے ہیں۔

☆ شاعری میں پیسہ نہیں ہے لیکن پیسے میں بھی شاعری نہیں ہے۔

(رابرٹ گریوز)

☆ بنیادی طور پر کتابیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو کوئی نہیں پڑھتا اور دوسری وہ جو کسی کو نہیں پڑھنی چاہییں۔ (ایچ ایل مینکن)

☆ مجھے یہ دریافت کرنے میں پندرہ سال لگ گئے کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیت نہیں ہے لیکن میں لکھنا نہیں چھوڑ سکا کیوں کہ اس وقت تک میں مشہور ہو چکا تھا۔ (رابرٹ بنچلے)

☆ قتل جرم ہے لیکن اس کو بیان کرنا جرم نہیں ہے۔ جنس جرم نہیں ہے لیکن اس کو بیان کرنا جرم ہے۔ (گریشن لیگ مین)

☆ ادب ایسی چیز لکھنے کا فن ہے جو دوبارہ پڑھی جائے۔ (سیرل کنولی)

☆ حضرات! میں مانتا ہوں کہ نپولین ایک ظالم حکم ران تھا، ایک عفریت تھا، ہماری قوم کا پکا دشمن تھا۔ لیکن حضرات! اس نے ایک دفعہ ایک پبلشر کو گولی بھی تو ماردی تھی! (تھامس کیمبل)

☆ میں کوئی کتاب اس وقت تک نہیں پڑھتا جب تک اس پر تبصرہ نہ لکھ لوں۔ تبصرہ لکھنے سے پہلے کتاب پڑھ لی جائے تو لکھنے والا تعصب کا شکار ہو جاتا ہے۔
(سڈنی اسمتھ)

اور مذکورہ بالا آخری قولِ زریں تو ایسا ہے جو (بقولِ یوسفی) ''دل کی سیاہی'' سے لکھنے کے قابل ہے۔ اور اگرچہ مستند ہے سڈنی اسمتھ کا فرمایا ہوا لیکن ہم اس پر عمل نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کتاب یعنی ''دی بک آف لٹریری لسٹس'' کے حق میں متعصب ہو گئے ہیں اور اس کی ڈھیر ساری تعریف کر ڈالی ہے۔ کیوں کہ ہم اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے اسے دو دفعہ پڑھ چکے تھے۔ پس ایک اور قولِ زریں سے ثابت ہوا کہ یہ کتاب بھی ''ادب'' ہے، کیوں کہ یہ دوبارہ پڑھی گئی ہے۔

○○○

پاکستان کے کنجوس ترین افراد کہاں رہتے ہیں؟

ہمارے ایک دوست کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ انھوں نے کتابوں کی دکان کرنے کا ارادہ فرمالیا۔ اچھی خاصی یعنی سرکاری ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور پرووڈینٹ فنڈ وغیرہ کے جو پیسے ہاتھ آئے ان سے کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی میں دکان خرید لی اور کتابیں سجا کر بیٹھ گئے۔

ہم نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میاں! کیوں وقت اور پیسہ برباد کر رہے ہو، اب کتابیں کوئی نہیں پڑھتا۔ بلکہ جو پڑھتے تھے، انھوں نے بھی کتابوں کی قیمتوں کے پیشِ نظر کتب بینی چھوڑ کر ''ڈش بینی'' جیسا مفید مشغلہ اختیار کرلیا ہے۔ سنا ہے کہ اس سے ایمان اور نظر تو کمزور ہوتے ہیں لیکن دل جوان ہوجاتا ہے اور پنشن یافتہ، فالج زدہ اور اسپتال رسیدہ بزرگ بھی ڈش دیکھنے کے بعد دوسری شادی کے لیے مچل اٹھتے ہیں۔ اسی لیے آج کل اسپتال کے کمرے میں بھی ڈش کی فراہمی کا اہتمام آکسیجن کی فراہمی سے بھی زیادہ کیا جارہا ہے۔ جس کا فوری نتیجہ یہ بھی ہے کہ اب کوئی نرس بمشکل ہی غیرشادی شدہ ملے گی کیوں کہ اکثر کی شادی مریضوں سے ہوچکی ہوگی۔

لیکن جس شخص کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ کتابیں پڑھنے، کتابیں ڈھونڈنے، کتابیں جمع کرنے اور کتابیں لکھنے میں صرف ہوگیا ہو (یا آج کل کے معیار کے مطابق رایگاں

گیا ہو) اسے ایسی عملی باتیں بھلا کہاں سمجھ میں آسکتی تھیں، لہٰذا جواباً وہ کتابی باتیں سنایا کرتے تھے۔ مثلاً پہلے ڈیفنس سوسائٹی کی تعریف میں ایک تقریر فرماتے پھر وہاں کے باشندگان کے اخلاقِ جمیلہ و صفاتِ حمیدہ پر تفصیلی روشنی ڈالتے اور کتابی دلائل سے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ کتاب کی فروخت کے لیے علاقے کے لوگوں کا تعلیم یافتہ، باذوق اور باثروت ہونا ضروری ہے، یہ ارشاد فرماتے کہ ''باشندگانِ ڈیفنس'' میں ان جملہ خوبیوں کے علاوہ دیگر کئی فالتو خوبیاں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ لہٰذا کتابوں کی دکان یہاں چلے ہی چلے۔''

خیر صاحب! دکان کھل گئی۔ چند ماہ بعد جب ابتدائی جوش و خروش کی جگہ ہوش و خرد نے لے لی اور اس عرصے میں صرف ایسے باتصویر رسالے ہی فروخت ہوسکے جن میں نا''محرم'' اور بے پردہ خواتین سر یا کمر وغیرہ پر طبی یا غیرطبی وجوہ کی بنا پر، ہاتھ رکھے حسب توفیق کھڑی، بیٹھی یا لیٹی تھیں تو ان کے حوصلے کے غبارے ایک ایک کر کے پھچاک پھچاک پچکتے چلے گئے۔ یہ بھی سنا گیا کہ وہ دکان کے غسل خانے میں ''کلامِ فانی'' وہ بھی ''منھ زبانی'' گایا کرتے ہیں۔ اور اقبال کی بجائے میر ''دکھی'' میر اُن کا محبوب شاعر بن گیا ہے۔

ان تشویش ناک اطلاعات پر ہم ان کی دکان پر پرسہ دینے پہنچے۔ دکان تو کیا سڑک پر بھی الو بول رہے تھے۔ وہ خود بھی کسی ایسے ہی پرندے کی طرح سر نیوڑائے بے ثباتیِ عالم اور ناقدریِ علم و ادب پر ہوک رہے تھے۔ ہم نے سلام کیا اور خیریت دریافت کی تو یوں مسکرائے جیسے وزیرِ خزانہ خسارے کا بجٹ پیش کرتے ہوئے ٹی وی کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے۔ یعنی کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ اپنی بے بسی پر مسکرا رہے ہیں یا سنگین حالات سے بے نیازی کا اظہار مقصود ہے یا حالات کی سنگینی کا کوئی علم ہی نہیں رکھتے۔

کاؤنٹر کے پیچھے دیوار پر ایک کاغذ چسپاں تھا جس پر انمول ادبی شہ پارے چالیس سے اَسّی فیصد تک رعایت پر دستیاب ہونے کا مژدہ درج تھا اور جو ''باذوق''

''باشندگانِ ڈیفنس'' کی ''ادب دوستی'' اور ''علم نوازی'' کا دستاویزی ثبوت تھا۔ ہم نے ذرا ہمت کی اور اس جانب اشارہ کیا تو بولے:

پیو کہ مفت لگادی ہے خونِ دل کی کشید

''لیکن آپ کا خیال تھا کہ ڈیفنس کے لوگ باذوق، تعلیم یافتہ اور باحیثیت ہیں لہٰذا...''

''باذوق ضرور ہیں'' انھوں نے بات کاٹ دی، البتہ یہ ذوق ذرا مختلف قسم کا ہے۔ اس علاقے میں ہر ماہ ویڈیو کیسٹس اور سی ڈی کی ایک نئی دکان کھلتی ہے اور خوب چلنے لگتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، یہ لوگ اس سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جس میں کوئی طالب علم خلاصے، گائیڈ، حل پرچہ جات، گیس پیپر اور آسان جوابات کی کتاب پوچھنے نہ آتا ہو۔

کچھ ہی دن قبل ایک بچی آئی۔ اس نے ''باغِ ڈیرا'' نامی کتاب مانگی۔ میں کچھ خوش کچھ حیران ہوا۔ خوش یوں کہ کسی نے کتاب اور وہ بھی اردو کی کتاب مانگی تو سہی، لیکن حیران یوں کہ یہ بھلا کون سی کتاب ہے؟ جب میں نے اس سے کتاب کا نام دوبارہ پوچھا تو بولی ''مجھے صحیح نہیں معلوم اسکول میں ''پوئٹری'' کا ''سیشن'' ہونے والا ہے۔ میری ''فرینڈ'' نے فون پر اس ''بک'' کا نام بتایا تھا۔ میں نے ''اسپیلنگ'' لکھ لی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کاغذ سامنے کیا تو اس پر لکھا تھا۔ Bag-e-Dara۔

تھوڑی سی عقل خرچ ہوئی مگر بات سمجھ میں آ گئی۔ ''اردو پوئٹری'' کی یہ ''بک'' جس کی اس نے (غلط) ''اسپیلنگ'' لکھ لی تھی اصل میں ''بانگِ درا'' تھی۔ جب ''بانگِ درا''، ''پوئٹری'' کی ''بک'' بن جائے اور اسے ''باغِ ڈیرا'' کہا جائے تو سر پیٹنے کے علاوہ اور کون سا شغل اختیار کیا جائے؟

''لیکن...'' ہم ممیائے۔

''سنتے رہو''۔ وہ دانت پیس کر بولے۔ ''جہاں تک دولت و ثروت کا تعلق ہے وہ ان لوگوں کے پاس اتنی ہے کہ جس پرفیوم کو لگا کر یہ آتے ہیں اور میری دکان بلکہ پوری سڑک مہکا دیتے ہیں اس کی قیمت ڈیڑھ ہزار روپے ہے۔ جس گاڑی میں تشریف

لاتے ہیں وہ گھر سے میری دکان تک پہنچنے اور ٹھنڈی رہنے (یعنی اے سی چلانے) کے لیے پچاس روپے کا پٹرول کھا جاتی ہے لیکن یہ دس روپے کی چیز پانچ روپے میں خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں خواتین کچھ ایسا رویہ اپناتی ہیں کہ لگتا ہے کتاب نہیں طارق روڈ پر غیر ملکی کپڑا خرید رہی ہیں۔ یعنی تین سو روپے گز سے بات شروع ہوتی ہے اور سو روپے گز پر معاملہ طے ہوجاتا ہے۔

''کچھ لوگ دکان میں داخل ہوتے ہی یہ پوچھتے ہیں کہ کتنا ''ڈسکاؤنٹ'' دیں گے، کتاب بعد میں پسند کرتے ہیں، بلکہ پسند نہیں کرتے۔ سیدھے کے ایف سی (KFC) جاتے ہیں اور ان پیسوں کا برگر کھالیتے ہیں میرا تجربہ کہتا ہے کہ پاکستان کے کنجوس ترین افراد ڈیفنس میں رہتے ہیں۔''

''آپ متضاد باتیں کررہے ہیں۔ اگر کنجوس ہیں تو برگر کیسے کھالیتے ہیں؟ پرفیوم کیسے خرید لیتے ہیں؟''

''بھائی میرے! پرفیوم کا لوگوں کو پتا ہے کہ بہت مہنگا ہے۔ برگر کھاتے ہوئے جو لوگ آپ دیکھتے ہیں انھیں بھی پتا ہے کہ کے ایف سی کا برگر نوے روپے کا ہے، گاڑی بھی لوگوں کو نظر آتی ہے۔ ان سب چیزوں سے معاشرے میں آپ کی حیثیت بڑھتی ہے، لوگ آپ پر رشک کرتے ہیں۔ لیکن مہنگی کتاب خریدنے سے آپ کا ''سوشل اسٹیٹس'' نہیں بڑھتا۔ اور ہر وہ چیز خریدنا فضول خرچی ہے جس سے آپ کا ''سوشل اسٹیٹس'' نہیں بڑھتا۔ گھر کے دروازے بند کر کے آپ دال روٹی کھالیں لیکن بیچ سڑک پر تو آپ کو مہنگا برگر ہی کھانا پڑے گا۔''

''تو پھر بند کرو یہ کتابوں کی دکان اور لگالو برگر۔''

چناں چہ اب وہ کتابیں اونے پونے بیچ رہے ہیں اور برگر یا ویڈیو کیسٹس کی دکان کرنے کا سوچ رہے ہیں تاکہ پاکستان کے امیر ترین، باذوق ترین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھاسکیں۔

OOO

ایک مزاحیہ رسالے کی تاریخ

اردو مزاح کی تاریخ میں جس جریدے کو سب سے زیادہ شہرت اور پذیرائی ملی وہ ''اودھ پنچ'' ہے۔ لیکن ''اودھ پنچ'' اصل میں ۱۸۴۱ء میں لندن سے نکلنے والے ''پنچ'' کے اتباع میں نکالا گیا تھا۔ ''اودھ پنچ'' تو خیر بند ہوا۔ پھر نکلا اور پھر بند ہو گیا۔ لندن پنچ بھی بہت سے نشیب و فراز سے گزرا لیکن بہت طویل عرصے تک نکلتا رہا اور ۱۹۹۲ء میں اسے بڑے افسوس کے ساتھ بند کیا گیا۔ پنچ کی موت کی باقاعدہ خبریں شائع کی گئیں ''مرحوم'' کی عمر تقریباً ڈیڑھ سو سال تھی۔

۱۹۹۶ء میں معروف مصری تاجر محمد الفائد نے اسے دوبارہ زندہ کیا لیکن ۲۰۰۲ء میں اسے پھر بند کرنا پڑا۔ گو اس کے قدیم شمارے اور کارٹون وغیرہ کمپیوٹر کے ذریعے یعنی online ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ (یہ وہی الفائد ہیں جن کے بیٹے کے ساتھ لیڈی ڈائنا کا نام لیا جاتا تھا)

لندن کا ''پنچ'' صرف رسالہ نہیں تھا۔ یہ ایک تحریک، ایک تاریخ اور ایک تہذیبی رویے کا نام تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں تھیکرے، جیمز تربر، پی جی ووڈ ہاؤس اور مارک ٹوین جیسے عظیم مزاح نگار شامل تھے۔ اس کی ابتدا ہنسنے ہنسانے کے خیال سے ہوئی تھی لیکن اپنے سیاسی اور سماجی مسلک، سخت نکتہ چینی اور احتساب کی وجہ سے اس کی

حیثیت رفتہ رفتہ انگلستان کے قومی ادارے کی سی ہوگئی تھی۔ اٹھارہ سو اکتالیس میں اس کا اجرا ہوا اور جلد ہی اس نے مقروض لوگوں کو قید کیے جانے نیز مجرموں کو سزائے موت دیے جانے کے خلاف مہم چلائی۔ بادشاہوں اور حکم رانوں کے خلاف اس کا رویہ بطورِ خاص جارحانہ تھا۔ عام لوگوں اور غریبوں کی حمایت میں اس نے آواز بلند کی۔ نجانے کیوں امریکیوں سے اسے اللہ واسطے کا بیر تھا اور اس نے ہمیشہ امریکیوں کی خوب بھد اڑھائی۔

اپنے سیاسی رویوں اور تنقید کی وجہ سے اس پر روس، آسٹریا اور فرانس میں پابندی عائد کر دی گئی۔ حتیٰ کہ اس کے ایک لطیفے پر چراغ پا ہو کر جرمنی کے حکم ران قیصر ولیم دوم نے اس کے ایڈیٹر کے سر کی قیمت مقرر کر دی تھی۔

آج لندن پنچ کا ذکر یوں نکل آیا کہ ہمیں فٹ پاتھ سے ایک دلچسپ کتاب ہاتھ آئی ہے جو دراصل پنچ کی غیر رسمی تاریخ ہے۔ اس کتاب پر سنگاپور کی نیشنل لائبریری کی مُہریں اور چپیاں لگی ہوئی ہیں۔ بلکہ ایک مُہر اسے لائبریری سے خارج کرکے اسے فروخت کرنے کے بارے میں بھی ہے۔ ساتھ ہی قیمتِ فروخت کی مہر لگی ہے: ایک ڈالر۔ گویا اسے سنگاپور میں ایک سنگاپوری ڈالر میں فروخت کیا گیا اور ہم نے اسے کراچی میں پچاس روپے میں صدر کے فٹ پاتھ سے خریدا۔ یہ کراچی کیسے پہنچی ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ پچاس روپے میں یہ مجلد کتاب تقریباً مفت ہے۔ اس کا نام ہے:

''مہاگنی کا درخت: پنچ کی غیر رسمی تاریخ''

(The Mahogany Tree: An Informal History Of Punch)

اب یہ بھی سن لیجیے کہ اسے مہاگنی درخت کا نام کیوں دیا گیا۔ دراصل پنچ کے دفتر میں ایک بہت بڑی، لمبی چوڑی میز پڑی رہتی تھی۔ یہ میز مہاگنی کی لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ تمام ادارتی اجلاس اسی میز پر ہوتے تھے اور اس میں بعض اوقات ادیبوں، آرٹسٹوں اور کارٹونسٹوں اور مشہور شخصیات کو، بالخصوص پنچ کے لکھنے والوں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ میز پنچ کے نظریات اور مباحث کی علامت بن گئی اور اسے معروف انگریزی

ادیب تھیکرے نے ''مہاگنی کا درخت'' قرار دیا۔ (ہماری رائے میں ایک ایسا درخت جس پر یہ سب پرندے بیٹھ کر چہچہایا کرتے تھے) تمام مشہور شخصیات کو دعوت دی جاتی تھی کہ وہ اس میز پر اپنے نام کے ابتدائی حروف کھود دیں (غالباً اس لیے کہ عجائب گھر میں رکھنے کے لیے کچھ ہاتھ آسکے)۔

اس میز پر ہفتہ وار اجلاس میں اگلے شمارے پر بحث کی جاتی تھی، کھانا کھایا جاتا اور کچھ ''پیا'' بھی جاتا تھا جس کے آثار میز پر آخر وقت تک موجود رہے۔

یہ تو خیر میز کا ذکر تھا۔ کتاب میں پنچ کا جائزہ بڑے دلچسپ انداز میں لیا گیا ہے۔ مصنف نے پنچ کے مدیروں سے اپنی ملاقات اور ''ایک ناقابلِ اعتبار امریکن'' یعنی خود (مصنف امریکی ہے) اپنے بارے میں ان کے شبہات کا بھی ذکر کیا ہے۔ آخرکار مصنف کو مدیروں نے اجازت دے دی کہ وہ پنچ پر تحقیق کرے اور پنچ کے قیمتی فائل اس کے حوالے کر دیے۔

کتاب میں پنچ کے کارٹون، اداریے، شذرے، نظمیں اور مضامین کے اقتباسات بھی دیے گئے ہیں۔ ایک دلچسپ بات پنچ کا اپنے معاصر جرائد کے ساتھ رکھا گیا رویہ تھا۔ پنچ نے دنیا کے معروف رسالے ''ریڈرز ڈائجسٹ'' کی خوب پیروڈی کی، امریکی رسالے ''نیویارکر'' کو بھی نہیں بخشا۔ حتیٰ کہ ''پلے بوائے'' جیسے بدنامِ زمانہ رسالے کو بھی نہیں چھوڑا۔

پنچ لندن (اس کا دوسرا نام ''لندن شاری واری'' تھا) کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس نے تاریخ میں پہلی بار کارٹون شائع کیے۔ اگرچہ اس سے پہلے ڈرائنگ کی یہ خاکہ نما صورت جسے کارٹون کہتے ہیں، موجود تھی لیکن کیمرے کی ایجاد سے قبل یہ صرف تصاویر کے متبادل کے طور پر ہی استعمال ہوتے تھے۔ پنچ نے یہ جدت برتی کہ اسے سیاسی اور سماجی طنز کے لیے استعمال کرنا شروع کیا اور اسے مضحکہ خیز بنا کر اس سے مزاح پیدا کیا۔ یہ رجحان اتنا مقبول ہوا کہ آج تک دنیا بھر کے اخبارات و رسائل اسے برتتے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی ڈرائنگ یا کارٹون اٹھارہ سو تینتالیس (۱۸۴۳ء) میں شائع کیا گیا

جس میں لندن کے غرباء کو ایک ایسی نمائش میں حیران و پریشان دکھایا گیا جہاں امیر اور مشہور آدمیوں کی شان دار تصاویر لگی تھیں۔ اس کے ساتھ یہ تحریر شائع کی گئی: ''غریب روٹی مانگتے ہیں لیکن حکومت کی فیاضی نمائش عطا کرتی ہے۔''

کارٹون کے ذکر پر یاد آیا کہ اپنے ہاں ''اودھ پنچ'' میں جہاں اور بہت کچھ لندن پنچ سے متاثر ہو کر شائع کیا جاتا تھا، وہاں کارٹون اور سرورق بھی پنچ سے متاثر ہو کر بنایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پنچ کے ایک کردار کی نوکیلی ٹوپی اور توتے کی چونچ جیسی ناک کو بھی ''اودھ پنچ'' نے اپنے کارٹونوں میں اپنا لیا تھا۔

پنچ کی یہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ بہت دلچسپ ہے لیکن اس زمانے میں بھی انگریزوں نے اپنے ہاں اخبارات کو جتنی آزادی دی تھی ہم آج اپنے ہاں اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہمارے ہاں اعلیٰ سیاسی شخصیات کو طنز کا نشانہ بنانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ کاش ہمارے ہاں کوئی پنچ پیدا ہو جائے۔

○○○

''اردو میں عربی الفاظ کا تلفظ''... ایک جائزہ

اردو میں غیرزبانوں کے الفاظ ایک کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ خاص کر فارسی اور عربی الفاظ نے اردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ یہ الفاظ جہاں ہماری زبان کو خوب صورتی، وسعت اور وقعت دیتے ہیں اور ہماری تہذیبی جڑوں کا ''منھ بولتا'' ثبوت ہیں وہاں ان کے حوالے سے کچھ سوالات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کئی الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم عربی یا فارسی میں کچھ ہے اور اردو میں کچھ اور ہوگیا ہے۔ اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ فارسی اور عربی کے الفاظ کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کا تلفظ اردو میں آ کر خاصا مختلف ہوگیا ہے، ان الفاظ کا کیا کیا جائے؟ خاص کر عربی الفاظ کے سلسلے میں یہ زیادہ اہم مسئلہ ہے کیوں کہ عربی میں زیر زبر کے فرق سے مفہوم تبدیل ہوجاتا ہے۔

عربی الفاظ کا تلفظ اردو کی لغات میں بالعموم عربی ہی کے لحاظ سے دیا جاتا ہے اور جہاں کہیں ضروری ہو عام طور پر وضاحت بھی کردی جاتی ہے کہ اردو میں اب اس کا تلفظ یوں ہوگیا ہے اور عربی میں یوں ہے۔ خاص طور پر مولوی نور الحسن نیر نے اپنی لغت ''نوراللغات'' میں الفاظ کے تلفظ کے سلسلے میں کئی مقامات پر اس کا اہتمام کیا ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے ہاں الفاظ کے تلفظ کو ظاہر کرنے کے لیے کوئی ایسا نظام نہیں ملتا جس میں یکسانیت اور باقاعدگی ہو۔ اگرچہ ان کے ہاں کم و بیش تمام الفاظ کا

تلفظ دینے کی سعی کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو کی ابتدائی لغات میں الفاظ کے صحیح تلفظ کو ظاہر کرنے کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ "نور اللغات" تو پھر بھی غنیمت ہے کیوں کہ یہ نسبتاً بعد کے دور کی تصنیف ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی معروف لغت "فرہنگِ آصفیہ" میں بہت کم الفاظ کا صحیح معنوں میں توضیحی تلفظ ملتا ہے۔ کسی لغت کی بنیادی خصوصیات میں اندراج و ترتیبِ الفاظ کے بعد غالباً تلفظ اور لسانی مآخذ ہی کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ اردو میں اس پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی۔

اردو میں عربی الفاظ کے تلفظ کی صحیح ادائیگی اور نشان دہی کے مسئلے پر یوں تو کافی کچھ لکھا گیا ہے لیکن قیوم ملک کی کتاب "اردو میں عربی الفاظ کا تلفظ" بالخصوص اسی موضوع پر ہے۔ پروفیسر قیوم صاحب خاصے عرصے تک درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ عربی کے علاوہ فارسی اور انگریزی پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ۱۹۷۹ء میں شائع کی تھی اور اہلِ علم نے اس کی بڑی پذیرائی کی تھی۔

کتاب کے دیباچے میں پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

"اردو کا ہر ادیب اور انشا پرداز یہ محسوس کرتا ہے کہ عربی اور فارسی سیکھے بغیر وہ اردو پر عبور حاصل نہیں کرسکتا۔ اردو کی حالت اس وقت وہ ہے جو انگریزی کی ایک سو سال پہلے تھی۔ تب انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے لاطینی اور یونانی زبانوں کا سیکھنا ضروری تھا۔ اب انگریزی اتنی ترقی کر گئی ہے کہ لاطینی اور یونانی زبانوں سے بے نیاز ہے۔ اردو ابھی اس منزل تک نہیں پہنچی ہے۔ بلند پایہ تحریر اور جدت پسند تخلیق کے لیے عربی سے استفادہ ناگزیر ہے۔"

پروفیسر صاحب نے اس دیباچے میں عربی الفاظ کے تلفظ کے بارے میں لکھا ہے:

"عربی سے واقف اردو دانوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر اَملاک کو اِملاک اور اَقساط کو اِقساط کہنے کی مشق جاری رہی تو آگے چل کر اَخبار کو اِخبار کہا جائے گا۔" مزید لکھتے ہیں کہ "ضروری ہے کہ عربی الفاظ میں زبر، پیش کے ردوبدل سے معنی میں جو تبدیلی

واقع ہوتی ہے اس سے (اہلِ وطن) بخوبی روشناس ہوں۔''

اس کتاب میں عربی الفاظ کے تلفظ کے قوانین کے ساتھ ساتھ ان کی قواعدی حیثیت (مثلاً اسم، فعل، مصدر، فاعل، مفعول وغیرہ) بھی واضح کی گئی ہے اور عربی بول چال کے قواعد بھی سکھائے گئے ہیں۔ تاہم پیچیدہ قسم کی اصطلاحات سے گریز کیا گیا ہے۔

یوں تو کتاب میں کئی ایسے دلچسپ اور مفید نکات دیے گئے ہیں کہ اردو اور عربی سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے تاہم کچھ اہم اور دلچسپ نکات پیش خدمت ہیں تاکہ جو قاری اصل کتاب کا مطالعہ نہ کرسکیں وہ کم از کم کچھ فیض تو حاصل کرسکیں۔

☆ عربی میں سہ حرفی الفاظ کے دوسرے حرف پر اکثر زبر آتا ہے یا جزم۔ مثلاً مرض، خبر، فکر، ملک۔ ان کی جمع عموماً اَفعال کے وزن (الف پر زبر) پر آتی ہے لیکن انھیں اِفعال کے وزن پر (الف کے نیچے زیر) لکھنے یا پڑھنے سے مفہوم قطعی بدل جاتا ہے جیسے۔

اِمراض ...مریض کرنا

اِخبار ...خبر دینا

اِملاک ... مالک بنانا

اِفکار ...سوچنا

جب کہ ان الفاظ کے پہلے حرف یعنی الف پر زبر لکھنے یا بولنے سے یہ جمع کا مفہوم دیتے ہیں۔

عربی میں حروف کی یکساں تعداد رکھنے والے الفاظ عام طور پر یکساں تلفظ اختیار کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا تلفظ ''وزن'' کے تحت آتا ہے، مثلاً:

اظہار، ارسال (اِفعال)

تبدیل، ترکیب (تفعیل)

تجمُّل، تبسُّم (تفعُّل)

محاسبہ، مراسلہ (مُفاعلہ)

تغافل، تجاوُز (تفاعل) وغیرہ۔

لہٰذا تلفظ کے ان قوانین کی رو سے ''اِفراط و تفریط'' اور ''اِفہام و تفہیم'' میں الف کے نیچے زیر کی بجائے اس پر زبر پڑھا جائے تو یہ اسم یا مصدر کی بجائے جمع کا مفہوم دیتے ہیں جو کہ ظاہر ہے غلط ہے۔

☆ گویا کسی لفظ کا تلفظ بگاڑنا اسے ایک وزن سے نکال کر دوسرے وزن میں داخل کرنا ہے۔ اور دوسرا وزن ممکن ہے کہ اسے جمع کی بجائے مصدر یا فاعل کی بجائے مفعول بنا دے، یہی وجہ ہے کہ منتظر، مرسل، مصنف، مخاطب اور مستعمل وغیرہ میں علی الترتیب ظ، س، ن، ط اور م پر زیر لگایا جائے تو یہ فاعل اور زبر لگایا جائے تو یہ مفعول کا مفہوم دیتے ہیں۔ مثلاً منتظِر کا مطلب ہے انتظار کرنے والا اور منتظَر کا مطلب ہے جس کا انتظار کیا جائے۔

☆ عربی کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اردو میں واحد استعمال ہوتے ہیں لیکن عربی میں جمع ہیں۔ مثلاً اسلحہ، اصول، افواہ، عملہ، کائنات، وفور وغیرہ۔ (ان کے واحد یہ ہیں سلاح، اصل، فوہ، عامل، کائنہ، وفر)۔

☆ کئی عربی الفاظ کا واحد اردو میں استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً اوباش، اوزار، تراویح، عمائد، ماکولات، مسکرات (ان کے واحد یہ ہیں: بوش، وزر، ترویحہ، عمید، ماکول مسکرہ)۔

☆ اردو میں عربی کے کئی الفاظ ''فاعِل'' کے وزن پر استعمال ہوتے ہیں مگر وہ فاعل کی بجائے اسم یا صفت کا مفہوم دیتے ہیں۔ مثلاً حاذق، خازن، شاطِر، فالج وغیرہ۔

☆ اردو میں ''عربی'' کے ایسے بہت سے الفاظ و تراکیب رائج ہیں جن کا عربی میں کوئی وجود نہیں جیسے لحاظ، حلاوت، سکونت، ذہنیت، شباہت، طبابت، عمرانیت، طوالت، قبولیت، لغویت، نفرت، اداریہ، تخمینہ، تعلقہ، فاصلہ، ضمیمہ، قرضہ، منصوبہ، نذرانہ، تبادلۂ خیال، دارومدار، مطلق العنان، نفری۔

☆ قیوم ملک صاحب نے ایسے الفاظ کی بھی فہرست دی ہے جن کا صحیح تلفظ کچھ اور ہے، یا جن کی ساخت بدل گئی ہے، یا اردو میں مختلف معنوں میں مستعمل ہیں۔

☆ عربی میں کئی الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے تلفظ میں اختلاف کی اجازت ہے۔ ان کی علیحدہ فہرست دی گئی ہے۔

☆ کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کی شکل جمع کی سی ہے لیکن اصل میں وہ واحد ہیں مثلاً مدارات، مراعات، مساوات، مفاجات، مکافات، مناجات، موالات۔

☆ بعض الفاظ بہت عجیب و غریب بھیس میں سامنے آتے ہیں۔ مثلاً تلاش اصل میں ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اور عربی میں تلاشی کے معنی ہیں تباہی۔ عربی میں متلاشی کے معنی ہیں معدوم ہوجانے والا۔ جب کہ اردو میں تلاشی اور متلاشی بالکل مختلف معنی رکھتے ہیں۔

☆ عربی میں "استقبالیہ" (Reception) پر کام کرنے والے کو المستقبل کہتے ہیں اور آنے والے زمانے (جسے اردو میں مستقبل کہا جاتا ہے) کو عربی میں مستقبل (ب پر زبر) کہتے ہیں۔ اردو سے اس کا موازنہ کرلیجیے۔ یہ ہے تلفظ کی نیرنگی۔

☆ مصلحت کی جمع ہے مصالح، لہٰذا اردو میں مصالحہ جات کی ترکیب درست نہیں ہے۔ (یہ مصنف کا خیال ہے اور ہمارا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں)

المختصر یہ کہ قیوم ملک کی کتاب "اردو میں عربی الفاظ کا تلفظ" ایک دلچسپ، مفید، معلوماتی اور فکر انگیز کتاب ہے۔ اردو اور عربی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ غور و فکر کی بہت سی راہیں کھولے گا۔

○○○

''لفظوں کی انجمن میں''... پر ایک نظر

ایک ''مشفق'' دوست کے توسط سے ایک ایسی کتاب ہاتھ آئی ہے کہ جی چاہتا ہے آج اس کا تذکرہ ہو۔ یہ کتاب لفظوں سے متعلق ہے۔

کتاب کا عنوان ہے ''لفظوں کی انجمن میں'' اور اس کے مصنف ہیں ڈاکٹر سیّد حامد حسین۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ نے دہلی سے شائع کی ہے اور اس میں ڈاکٹر صاحب کے وہ مضامین یک جا کیے گئے ہیں جو انھوں نے الفاظ کے استعمال، ان کے بننے اور ان کی اصل کے بارے میں سپردِ قلم کیے تھے اور بھارت میں مختلف علمی و ادبی جریدوں میں شائع ہوئے تھے۔

کتاب کا پہلا مضمون پیشوں اور پیشہ وروں کے بارے میں ہے۔ اس میں مصنف نے مختلف پیشوں اور پیشہ وروں کے ناموں پر روشنی ڈالی ہے کہ وہ کس طرح بنے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض دلچسپ باتیں بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً لفظ ملاّح کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ جس عربی لفظ سے نکلا ہے اس کے معنی ہیں نمکین۔ چوں کہ سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے لہٰذا کھارے پن سے سمندر بھی مراد لینے لگے۔ اصل میں سمندر کے پانی سے نمک بنانے والے کو پہلے ملاّح کہتے تھے اور پھر سمندر میں جانے والے اور کشتی والے کو بھی ملاّح کہا جانے لگا۔ اب اگر کوئی دریا یا جھیل کے میٹھے پانی میں بھی

کشتی چلائے تو ملاح کہلاتا ہے۔

البتہ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں کہیں بھی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا نہ ہی آخر میں فہرستِ اسناد دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر قیاس آرائی یا مغالطے کو بڑے وثوق سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً لفظ باورچی کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اس رائے سے اتفاق کرلیا گیا ہے کہ باورچی کے معنی ہیں کھانا پکانے کے فن کا ماہر۔ حالاں کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی کتاب ''لسانی مسائل'' کے ایک مضمون ''باورچی یعنی چہ'' میں اس خیال کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ فارسی کا نہیں روی زبان کا لفظ ہے اور اس میں ''چی'' کا لاحقہ اصل میں ترکی ہے۔ یہ لفظ غالباً روی ترکستان سے ترکی پہنچا اور پھر ایران سے ہوتا ہوا برِعظیم پاک و ہند تک آگیا۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے ''حلال خور'' یعنی بھنگی کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ ان لوگوں کو مردار کھانے سے کوئی پرہیز نہیں ہوتا لٰہذا اس امر سے چشم پوشی کی خاطر یہ نام دیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ غالباً یہ بھی محض ان کا قیاس ہے۔ ''نور اللغات'' کے مطابق بھنگیوں کو یہ نام اکبر بادشاہ نے دیا تھا ''فرہنگِ آصفیہ'' بھی اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس میں اس کے ایک معنی یہ بھی دیئے گئے ہیں کہ ''حق حلال کی اجرت کھانے والا۔''

ہماری دانست میں بھی ان بے چاروں کے کام یعنی گندگی ڈھونے کو دیکھا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ ان کی اجرت واقعی حلال ہے۔

اس طرح لفظ ماسٹر، قلی اور مالی کی اصل بھی بغیر کسی سند یا حوالے سے بیان کیا گئی ہے اور غالباً ڈاکٹر صاحب کے قیاس پر مبنی ہے۔

اگلے مضمون ''تعصب کی زبان'' میں بتایا گیا ہے کہ اگر ایک فرقے کی دل آزاری کے لیے حجام کو خلیفہ کہنے کا رواج ڈالا جاتا ہے تو جواباً غنڈے اور بدمعاش کو ''شہدہ'' کہہ کر شہدائے کربلا کی بے حرمتی سے باک نہیں ہوتا۔''

بات یہ ہے کہ تعصب کی زبان کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب خود تعصب کا شکار ہوگئے ہیں۔ انھوں نے لفظ ''شہدہ'' کی اصل کی تحقیق کرنے کی بجائے قیاس سے کام

لیا ہے اور ایک فرقے پر محترم و مکرم و معظم شہدائے کربلا کی بے حرمتی کا الزام رکھ دیا ہے۔

شان الحق حقی صاحب نے اپنے ایک مضمون ''لفظ شہدا کی اصل'' میں اس لفظ کے بارے میں دادِ تحقیق دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عربی میں ''شُہَدا'' میں ''ہ'' پر زبر ہے۔ یہ ساکن نہیں جیسا کہ لفظ شہدا یا شہدہ میں ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ:

''مسلمان اور جو کچھ بھی کریں شہدا کی بے حرمتی نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی معنوی ربط بھی نہیں۔ بھلا کیوں آوارہ، بدقماش لوگوں کو شہدا کے پاکیزہ لقب سے پکارا جاتا۔ پھر شہدا بمعنی شاہدین تو جمع کا صیغہ ہے۔ شہدا واحد اور اس کی جمع شہدے۔ یوں بھی کوئی ربط نہیں پیدا ہوتا۔ اس لفظ کی اصل کی طرف اشارہ مجھے آچاریہ چانکیہ کے ''ارتھ شاستر'' کے اردو ترجمے کے دوران ملا۔ انھوں نے ہاتھیوں کی تربیت کے بیان میں شریر ہاتھی کی ایک قسم ''شدھا'' بتائی ہے۔''

گویا شہدا کی اصل ''شدھا'' ہے جس کے معنی ہیں وہ ہاتھی جو شریر، چالاک اور بدفطرت ہو۔

حقی صاحب کا یہ مضمون ان کی کتاب ''لسانی مسائل و لطائف'' میں شامل ہے جو مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی ہے۔

ڈاکٹر حامد حسین صاحب نے آگے چل کر ایک لفظ کی نہایت عجیب و غریب تاویل پیش کی ہے۔ اسلامی کیلنڈر کے دو مہینوں جمادی الاوّل اور جمادی الآخر کے بارے میں لکھتے ہیں ''جمادی کے معنی کے بارے میں دو نظریے ہیں ایک تو یہ کہ اس کے معنی سخت اور بلند زمین کے ہیں کیوں کہ ان دو مہینوں میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین کی خشکی بڑھ جاتی ہے اور زمین سخت اور کڑی ہو جاتی ہے۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ جمادی سردی پڑنے کی وجہ سے پانی جم جانے کی جانب اشارہ کرتا ہے لیکن عرب جیسے ریگستانی خطے میں برف جمنے کا اشارہ ناموزوں ہے۔''

اس اقتباس کے بارے میں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ اسلامی کیلنڈر عیسائی کیلنڈر کے مقابلے میں تقریباً دس دن چھوٹا ہوتا ہے۔ گویا ہر تین سال کے بعد اسلامی اور عیسوی تاریخوں میں ایک مہینے کا فرق پڑ جاتا ہے اور تقریباً پندرہ سال کے

عرصے میں پانچ مہینے کا فرق پڑتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ فرض کریں اگر آج جمادی الاوّل اور جمادی الآخر کے مہینے دسمبر جنوری کے مہینوں میں پڑتے ہیں تو پندرہ سترہ سال بعد یہ جون جولائی میں آئیں گے۔ گویا ان مہینوں میں سردی کی بجائے گرمی کا موسم ہوگا۔ یعنی سردی اور گرمی کا تصور عیسوی کیلنڈر کے مہینوں کے ساتھ تو مخصوص ہوسکتا ہے کیوں کہ نصف کرۂ شمالی میں جنوری میں ہمیشہ سردی ہوتی ہے اور جون میں ہمیشہ گرمی ہوتی ہے۔ لیکن جمادی الاوّل کبھی گرمیوں میں آتا ہے اور کبھی سردیوں میں۔

لہٰذا ان اسلامی مہینوں کے ساتھ بارش ہونے یا نہ ہونے یا سردی پڑنے کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے۔

رنگوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے وہائٹ ہاؤس کے بارے میں لکھا ہے کہ انگریزوں کے حملے کی وجہ سے اس کی دیواریں جھلس گئی تھیں اور ان پر سفیدی کی گئی جس کے بعد اِس عمارت کا نام ہی وہائٹ ہاؤس پڑ گیا۔ یہاں تک تو بات درست ہے لیکن آگے چل کر لکھتے ہیں کہ امریکی مورخین اس حملے میں انگریزوں کے غلبے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور وہ اس طرح لکھتے ہیں جیسے یہ عمارت ہمیشہ سے سفید ہے۔

امریکی مورخوں کے بارے میں یہ بات کہنا اصل میں سچائی کو ٹھینگا دکھانے کے مترادف ہے۔ راقم الحروف نے خود ایک امریکی مصنف کا یہ بیان پڑھا ہے کہ یہ عمارت جل کر سیاہ ہوگئی تھی جس کے بعد اس پر سفید رنگ کردیا گیا اور اسی رنگ کی مناسبت سے اس کا نام وہائٹ ہاؤس پڑ گیا۔

اصل میں ڈاکٹر صاحب نے تمام قارئین کو معصوم اور بے خبر سمجھتے ہوئے جہاں الفاظ کے بارے میں قیاس کے گھوڑے دوڑائے ہیں، وہاں تاریخ پر بھی ہاتھ صاف کر ڈالا ہے۔ امریکی جیسے بھی ہوں، اتنے احمق اور حقائق سے آنکھیں چرانے والے نہیں ہیں۔

کتابت کی بعض اغلاط، چھوٹی موٹی فروگزاشتوں اور بعض قیاس آرائیوں سے قطع نظر الفاظ سے دلچسپی رکھنے والے اس کتاب کو قابل مطالعہ پائیں گے۔

○○○

محمد حسین آزاد کی ایک کتاب

محمد حسین آزاد کا شمار اردو کے عناصرِ خمسہ میں ہوتا ہے۔ ان کا نام نہ صرف یہ کہ جدید اردو شاعری کے سلسلے میں لیا جاتا ہے بلکہ تاریخ نویسی، ادبی تاریخ اور تذکرہ نگاری کے علاوہ کتاب شناسی بھی ان کا میدان تھا۔ زبانوں کی اصل، ان کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ خاص طور پر اردو اور فارسی الفاظ کے ایسے سچے پارکھ تھے کہ اردو نے ایسا جوہری شاید ہی دیکھا ہو۔ ان کی کتاب ''آبِ حیات'' اگرچہ اردو شاعری کا اور اردو کے شاعروں کا تذکرہ ہے لیکن اس کی تمہید کے طور پر انھوں نے اردو کی ابتدا کا جو حال لکھا ہے وہ لسانیات سے ان کی دلچسپی کا شاہد ہے۔ اگرچہ جدید تحقیق سے ''آبِ حیات'' کی بعض اغلاط کا احساس ہوا ہے لیکن اس سے اس کی اہمیت میں کمی نہیں ہوتی۔

آزاد کی لسانیات، لغات اور لفظیات سے دلچسپی بلکہ اس پر ان کے عبور کا صحیح اندازہ ان کی ایک اور کتاب سے ہوتا ہے۔ اسی کا نام ہے ''سخن دانِ فارس۔'' اس کتاب کا شمار لسانیات کے موضوع پر اردو میں لکھی گئی ابتدائی کتب میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج علمِ لسانیات کہیں کا کہیں نکل گیا ہے اور اس کے اصول و قواعد اور مبادیات آزاد کے دور سے بہت مختلف ہیں۔ اس کتاب کے توسط سے فارسی اور سنسکرت الفاظ کی

اصل اور ان کے موازنے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ آزاد نے اس حقیقت پر بہت زور دیا کہ قدیم سنسکرت اور قدیم فارسی میں بہت گہرا رشتہ تھا بلکہ دونوں بہنیں تھیں۔ ان کے نزدیک بے شمار فارسی الفاظ ایسے ہیں جو سنسکرت میں بھی وجود رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی زمانے میں یہ ایک ہی زبان تھی اور اس کے بولنے والوں کے مختلف گروہ ہوگئے۔ جن میں سے ایک شاخ ہندوستان آگئی اور دوسری ایران چلی گئی اور رفتہ رفتہ حالات، رسوم و رواج اور بیرونی اثرات کے تحت ان زبانوں میں فرق آتا گیا۔ لیکن آج بھی سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو تلفظ یا لہجے کے معمولی فرق کو چھوڑ کر ایک ہی ہیں۔ ایسے الفاظ پر آزاد نے طویل بحث کی ہے اور بے شمار مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ قدیم فارسی اور قدیم سنسکرت کتنی مشابہت اور مماثلت رکھتی تھیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

اردو	فارسی	سنسکرت
ماں	مادر	ماتری (اسی سے ماتا بنا)
باپ	پدر	پتری (اسی سے پتا بنا)
بھائی	برادر	بھراتری
بیٹی	دُختر	دُہتری
سسر	خسر	سوُسر
سر	سر	شِر
گلا	گلو	گل
بازو	بازو	باہو
انگلی	انگشت	انگشت
پاؤں	پا (یا پائے)	پاؤ
چاند	ماہ	ماس
رات	شب	شپا
دھواں	دود	دھوم۔ دھواں

جَو	جَو	یَو (یےَ و)
مٹکا	خُم	کُمبھ
گائے	گاؤ	گَو
گھوڑا	اسپ	اَشْو
ایک	یک	ایک
پانچ	پنج	پنج

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ آزاد نے اپنی کتاب میں خاصی تفصیل سے اصول بھی بتائے ہیں کہ کس طرح فارسی لفظوں کے بعض حروف سنسکرت میں جا کر بدل جاتے ہیں یا ساکن حرف متحرک ہوجاتا ہے یا متحرک ساکن بن جاتا ہے۔

آزاد کا یہ سارا علم محض کتابی ہر گز نہیں تھا، اگرچہ اس کے لیے انھوں نے کتابوں سے بہت مدد لی۔ بقول خود ان کے کتابوں کے لیے وہ بمبئی گئے اور ایران بھی پہنچے۔ لیکن سفرِ ایران سے ان کو بہت فائدہ ہوا اور انھوں نے تجربات و مشاہدات کے ذریعے فارسی اَلفاظ کی اصل کا کھوج لگایا اور انھیں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سے انھیں احساس ہوا کہ ہر ملتے جلتے فارسی لفظ کو سنسکرت پر قیاس کرنا درست نہیں۔ اس کی مثال کے طور پر انھوں نے اپنے سفر ایران اور افغانستان کے دو واقعات بھی پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک میں یہ بیان ہوا ہے کہ کس طرح ایک ازبک بوڑھا لفظ ''لارڈ'' کو ''لات'' سمجھا تھا۔ آزاد نے وہ قصہ کچھ یوں بیان کیا ہے: (واضح رہے کہ لات و منات قدیم عرب میں بتوں کے نام تھے جن کی پوجا ہوتی تھی۔) ''ایک دن میں، کوکان میں چند اشخاص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چائے کا دور چل رہا تھا، ایک بڈھے فرتوت نے پوچھا (یہاں آزاد نے جہاں جہاں مکالوں میں فارسی لکھی ہے ہم اس کا ترجمہ دیں گے۔) ''تمھارے ملک میں فرنگی حکومت کرتا ہے؟'' میں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا ''اس کا نام کیا ہے؟'' میں نے کہا بادشاہ تو خود اپنے ملک فرنگ میں دارالحکومت میں ہے۔ ہمارے ملک کے لیے اس نے نائب بھیج رکھا ہے۔ وہ حکم رانی کرتا ہے۔ ہمارا بادشاہ تو وہی ہے۔

پوچھا ''آخر اس کا کیا نام ہے؟'' میں نے کہا کہ ہر چند سال بعد بدل جاتا ہے۔ البتہ بہ اعتبارِ عہدہ و منصب اسے لات کہتے ہیں۔ (یہاں آزاد نے لارڈ کی بجائے لات ہی لکھا ہے کیونکہ فارسی میں ''ڈ'' تو ہوتی نہیں) ایک بولا ''گوبرناس باشد'' (یعنی گورنر؟) میں نے کہا ہاں وہی۔ ایک اور ترک نے کہا ''لات کے کیا معنی ہیں؟'' میں نے تامل کیا کہ کیا کہوں۔ دوسرا بولا ''وہی لات اور منات ہے۔'' دوسرا بولا ''نہیں، فرنگی بت پرست نہیں ہے۔'' بڈھے ازبک نے کہا ''آخر کافر ہے۔ کفر ہر جگہ ایک ہی ہے۔ لات یہی لات اور منات ہے۔''

اس کے بعد آزاد لکھتے ہیں:

''لاٹھ کو اور لارڈ کے معنوں کو دیکھو کہ ہندوستان میں آ کر لفظ میں کیا تغیر پیدا ہوا؟ اور معنی اس کے یہاں کیا خیال پیدا کرتے ہیں۔ پھر اس ازبک کو دیکھو کہ کیا سمجھا اور دلیل کیا خوب پیدا کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلیتِ الفاظ کی تحقیق بہت نازک کام ہے۔ قیاس و انداز ہمارا ہرگز قابل اطمینان نہیں۔ اندھیرے میں تیر پھینکتے ہیں۔ لگا تو لگا ورنہ یا قسمت۔''

اس ضمن میں انھوں نے کئی ایسے عربی اور فارسی الفاظ لکھے ہیں جن کی اصل کو غلطی سے کچھ کا کچھ بیان کیا جاتا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں گیارہ ''لیکچر'' یا گیارہ ابواب ہیں جن میں آزاد نے قدیم فارسی کی تاریخ اور اس کے بدلتے رنگ ڈھنگ کا ذکر کیا ہے خاص طور پر اسلام کی آمد نے فارسی زبان اور اہلِ ایران کے تمدن پر جو اثرات ڈالے، اس کا ذکر دو تین ابواب میں کیا ہے۔ فارسی کی قدیم اور اہم کتابوں کا عہد بہ عہد احوال بیان کر کے ان کے فرق بتائے ہیں۔

پانچویں لیکچر میں آزاد نے ایران کی تاریخ، تہذیب اور حکم رانوں کے فارسی زبان پر اثرات بیان کرتے ہوئے بعض نہایت دلچسپ حکایات بھی بیان کی ہیں۔ اس کے علاوہ سنسکرت کے قدیم شاستروں میں درج توہمات اور عقائد بیان کر کے انھیں

ایرانیوں کے رسوم و رواج اور عقائد و توہمات میں تلاش کیا ہے اور ہر دور کے لیے رائج الفاظ بیان کیے ہیں۔ یہ ایک طرح سے قدیم ایران اور قدیم ہندوستان کے علم الاصنام یا علم الاساطیر یعنی مائتھولوجی (Mythology) کا موازنہ ہے۔ اگرچہ آزاد نے مائتھولوجی کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن ایرانی حکم رانوں کے فرمان جو آئین فرہنگ کہلاتے تھے اور شاستر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

چھٹے باب میں اسلام کے فارسی اور ایرانی معاشرے پر اثرات کے ضمن میں اپنے تجربات اور مشاہدات سے بھی کام لیا ہے اور علم سے بھی۔ کئی دلچسپ واقعات بھی لکھے ہیں۔ بلکہ یہ باب کہیں کہیں تو سفرنامہ معلوم ہوتا ہے۔ لفظ ''برقع'' کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ برقع اسلام کے ساتھ ایران میں آیا۔ اسی لیے فارسی میں اس کے لیے کوئی لفظ نہیں، عربی لفظ ''برقع'' ہی استعمال ہوتا ہے اس زمانے میں ایرانی عورتیں اتنا سخت پردہ کرتی تھیں کہ بقول آزاد پاؤں کا ناخن یا جلد کا رنگ تک نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ اگر گلی کوچے میں کوئی شخص کسی عورت کو گھورے تو وہ اسے ٹھیک ٹھاک مغلظات سنا دیتی تھی۔

ساتویں باب میں کسی خطے کے موسموں کا وہاں کی انشا پردازی پر اثر دکھایا ہے اور بعض جگہ ایران کے موسموں، قدرتی مناظر اور معاشرت کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ ایک تو ''زبان و بیان'' کا بیان اور پھر اوپر سے آزاد کا رنگین اور تخیلی انداز۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ دو آتشہ ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کے صفحات نقل کر دیے جائیں لیکن افسوس کہ یہ ممکن نہیں۔ اگر ہو سکے تو کہیں سے لے کر پڑھ ڈالیے۔ اب تو نایاب ہو چکی ہے۔

بعد میں بھی کئی ایڈیشن نکلے لیکن پچھلے بیس پچیس سالوں میں شاید ہی کوئی ایڈیشن پاکستان سے چھپا ہو۔ البتہ ۱۹۷۹ء میں اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) نے ایک ایڈیشن چھاپا تھا اس کا کوئی نسخہ شاید آپ کو مل جائے۔☆

''سخن دانِ فارس'' کا پہلا حصہ تو ۱۸۷۶ء میں شائع ہو گیا تھا لیکن دوسرا حصہ

☆۔ چھپتے چھپتے اطلاع ملی ہے کہ لاہور سے اس کا ایک نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

جو گیارہ لیکچروں پر مشتمل ہے مسودے کی شکل میں تھا۔ تا آں کہ آزاد نے ۱۸۸۵ء میں ایران سے واپسی کے بعد اس پر نظر ثانی کی اور ۱۸۸۷ء میں یہ کام مکمل ہوگیا تھا۔ لیکن آزاد کی دیوانگی کی وجہ سے اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ آخرکار اسے آزاد کے صاحب زادے آغا محمد ابراہیم نے ۱۹۰۷ء میں شائع کرایا۔ یہ معلومات ہمیں ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب ''آبِ حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین'' سے میسر آئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ ''سخن دانِ فارس'' میں کئی معلومات ایسی ہیں جو جان مالکم کی کتاب ''تاریخِ ایران'' سے ماخوذ ہیں بلکہ بعض مقامات پر لفظی یا آزاد ترجمہ ملتا ہے۔ البتہ آزاد نے استفادے کا کہیں وضاحت سے ذکر نہیں کیا۔ ایک اور اہم بات جو ڈاکٹر محمد صادق نے اس مضمون میں منکشف کی ہے وہ یہ ہے کہ آزاد کو وسط ایشیا کی سیاحت کے دوران جو تجربات و مشاہدات ہوئے تھے ان میں سے کئی ایک ایسے ہیں جوانھوں نے اس کتاب میں ایران پر منطبق کر کے پیش کردیے ہیں۔

دراصل آزاد ایران ۱۸۸۵ء میں گئے تھے اور ۱۸۶۵ء میں انھوں نے انگریزوں کے ''پرچہ نویس'' کی حیثیت سے وسط ایشیا کا جو سفر کیا تھا اس کا ذکر وہ گول کر گئے تھے۔ البتہ وسط ایشیا کی سردی وغیرہ کا احوال انھوں نے ایران کے نام سے بیان کردیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد انگریزوں کے جاسوس کی حیثیت سے روس کی جاسوسی کرنے وسط ایشیا گئے تھے جسے ڈاکٹر محمد صادق نے ''پرچہ نویس'' کا ہلکا پھلکا نام دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر محمد صادق محمد حسین آزاد کے عاشقِ صادق تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے لاہور میں رہائش کے لیے مکان بھی وہی حاصل کیا جس میں آزاد رہائش پذیر رہے۔ یہ وہی ڈاکٹر صادق ہیں جن کا ٹی وی پر انٹرویو دیتے ہوئے نتقال ہوگیا تھا۔ خیر یہ قصہ اور ہے۔

○○○

''ہمارا تلفظ''... ایک اہم کتاب

قبل اس کے کہ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی کتاب ''ہمارا تلفظ'' کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے، ڈاکٹر صاحب قبلہ کا مختصر ذکر بھی ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب کا شمار اس وقت برِعظیم پاک و ہند کے چوٹی کے علما اور محققین میں ہوتا ہے۔ گزشتہ ساٹھ سال سے زائد عرصے سے درس و تدریس، تحقیق و تنقیح اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ ان کی دینی خدمات اس پر مستزاد ہیں۔ آپ دورِ حاضر میں پاکستان میں فارسی کے سب سے بڑے عالم اور محقق ہیں۔ آپ نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے فارسی اور اردو میں ایم اے کرنے کے بعد وہیں سے ایل ایل بی بھی کیا۔ اس کے بعد ناگپور یونی ورسٹی سے فارسی میں دوبارہ ایم اے کر کے وہیں سے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا۔ بعدازاں ناگ پور یونی ورسٹی نے آپ کی تین اردو تصانیف پر ڈی لٹ کی سند بھی تفویض کی۔

ڈاکٹر صاحب پی ایچ ڈی کے پچاس کے لگ بھگ مقالوں کے نگراں رہے اور پی ایچ ڈی کے بے شمار مقالوں کے ممتحن بھی۔ (پی ایچ ڈی میں ہمارے بھی ممتحن تھے اور ان کی شفقت آج تک یاد ہے) ادب، مذہب، تاریخ اور تحقیق کے علاوہ لغات و لفظیات بھی ڈاکٹر صاحب قبلہ کا خاص موضوع ہے بلکہ صحیح معنوں میں یہ ہم سب کی

خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسا فاضل اور محقق اِملا اور لغت کے مسائل کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔

ڈاکٹر صاحب زبان کے استعمال میں حد درجہ احتیاط برتتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ الفاظ و تراکیب کے استعمال کے سلسلے میں بہت حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں، بلکہ املا کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر بھی ان کی تحریر سے عیاں ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو ڈاکٹر صاحب کی تحریر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے (مثلاً وہ لوگ جنھیں ڈاکٹر صاحب خط لکھتے ہیں) وہ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اِملا کے اصولوں اور اس ضمن میں اپنے نظریات پر کس قدر احتیاط سے عمل کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کے قلم سے "لیے" کی بجائے "لئے" لکھا جائے یا اسی طرح کی کوئی چھوٹی موٹی غلطی بھی ہوجائے جسے عام طور پر روا رکھا جاتا ہے۔

ان حقائق کو ذہن میں رکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب قبلہ کے قلم سے اردو املا اور تلفظ سے متعلق کوئی چھوٹا موٹا مضمون بھی ہم جیسے عامیوں کے لیے کسی سوغات سے کم نہیں اور اگر اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی کوئی کتاب بھی مل جائے تو اسے نعمتِ عظمیٰ سمجھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کی کتاب "ہمارا تلفظ" نظر آئی تو ہم نے پہلی فرصت میں اسے پڑھنا شروع کردیا۔

ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ: "بعض حضرات (بے خیالی میں) لکھتے کچھ ہیں اور بولتے کچھ ہیں۔ بلکہ عام الفاظ کی صحت کا بھی خیال نہیں کرتے... ان شاء اللہ اور ماشاء اللہ کا ہمزہ نہیں لکھتے۔ سَحَر اور سِحر میں فرق نہیں کرتے۔ رِفعت، اِستغفار، شِفا کے پہلے حرف پر زبر پڑھتے ہیں۔ چناں چہ اس قسم کے الفاظ کے صحیح تلفظ کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانے کی یہ ناچیز کوشش کی جارہی ہے۔ ساتھ ہی دوسرے الفاظ بھی شامل ہیں جو مختلف مواقع پر کام آتے ہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے الفاظ کی خاصی تعداد کا صحیح املا اور تلفظ واضح کیا ہے۔ حواشی میں مزید وضاحتیں کی ہیں اور جہاں کہیں ضرورت پڑی مناسب اشعار بھی

مثالوں کے لیے درج کر دیے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی اور معلومات کی غرض سے کتاب سے کچھ الفاظ اور ان کے بارے میں کی گئی صراحت ہم پیش کرتے ہیں۔ کتاب لغت کے انداز میں الف بائی ترتیب سے ہے، لیکن ہم الفاظ ذرا مختلف انداز سے پیش کریں گے۔

آذر اور آزر

ان دوالفاظ کے بارے میں اکثر مغالطہ رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کی ہے کہ آذر (ذال سے) ایرانی شمسی سال کا پہلا مہینہ ہے اور اس کے معنی ''آگ'' کے بھی ہیں نیز یہ کہ اس کے اور بھی کئی معنی ہیں۔ جب کہ آزر (زے سے) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تھا (بعض علما کے نزدیک وہ چچا تھے)۔

اُتّم اور اَتمّ

اُتّم (یعنی ت پر تشدید) ہندی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: اعلیٰ، عمدہ۔ جب کہ اَتمّ (یعنی میم پر تشدید) عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: نہایت مکمل۔

اِلف اور اَلف

اَلِف حروفِ تہجی کا پہلا حرف ہے۔ اس کے معنی ''لمبا زخم'' بھی ہیں۔ لیکن اَلف (یعنی الف پر زبر اور لام پر جزم) کے معنی ہیں: ہزار۔

اَولیٰ اور اُولیٰ

اَولیٰ کے معنی ہیں بہتر، بہت اچھا۔ لیکن الف پر زبر کی بجائے پیش ہو (یعنی اُولیٰ) تو مطلب ہے: پہلی، یعنی اوّل کی تانیث۔

بارِ خدا اور بارے

''بارِ خدا'' میں ''بار'' دراصل باری کا مخفف ہے۔ (باری کے معنی ہیں بزرگ و برتر) حالی کا شعر:

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا

جب کہ ''بارے'' کے معنی ہیں: ''آخرکار، الغرض۔''

میر کا شعر ہے:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ، یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

بالمشافہ نہیں بالمشافہہ

لفظ بالمشافہہ (دو ''ہ'') میں بالعموم ایک بار ''ہ'' لکھی جاتی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اس کے املا میں دو دفعہ ''ہ'' ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں: ''سامنے''۔ اسی طرح لفظ جبہہ (پیشانی) اور شبیہہ میں بھی دو ''ہ'' ہیں۔

پایہ تخت نہیں پائے تخت

پائے تخت کو اکثر لوگ پایۂ تخت لکھتے ہیں جو غلط ہے۔ یہاں ہم اتنا عرض کر دیں کہ یہاں لفظ ''پائے'' میں ہمزہ ہم نے لکھا ہے، ڈاکٹر صاحب چوں کہ ایسے مواقع پر ہمزہ کے استعمال کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا کتاب میں بھی اس لفظ پر ہمزہ نہیں لکھا گیا۔

پتہ نہیں پتا

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ''پتا'' کو ''پتہ'' لکھنا صحیح نہیں کیوں کہ یہ ہندی کا لفظ ہے اور ہندی الفاظ کے آخر میں ''ہ'' نہیں ہے۔

چارا اور چارہ

چارا کے معنی ہیں مویشیوں کی خوراک اور اگر اس میں الف کی بجائے ''ہ'' ہو یعنی چارہ، تو معنی ہوں گے: ''علاج یا تدبیر۔''

خَلقت اور خِلقت

خَلقت (خ پر زبر) کے معنی ہیں: لوگ۔ خِلقت (یعنی خ میں زیر) کے معنی ہیں پیدائش یا فطرت۔

دراز

دراز دراصل انگریزی کے لفظ Drawer کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ معنی ہیں صندوق یا میز کا خانہ۔

ذرا

قدما کے یہاں "ذرّہ" ملتا ہے۔ اب ذرا ہے۔ اس کے معنی ہیں: "کچھ"۔ البتہ "ذرا سنیے گا" میں ذرا "ازراہ کرم" کی رعایت رکھتا ہے۔

سَخُن اور سُخَن

سَخُن (یعنی س پر زبر اور خ پر پیش) اور سُخَن (یعنی س پر پیش اور خ پر زبر) دونوں درست ہیں۔

سَلف اور سُلف

سَلف (س پر زبر) کے معنی ہیں گزرا ہوا۔ گزرے ہوئے لوگ یعنی بزرگ اور آبا و اجداد کو بھی سلف کہتے ہیں۔ اس کی جمع ہے اسلاف۔ سُلف (اس پر پیش) کے معنی ہیں سامان۔ اسی لیے سودا سُلف بولتے ہیں۔ جب کہ سُلفا کے معنی ہیں تمباکو جو چلم میں ڈالتے ہیں۔

برأت اور برات

برأت عربی کا لفظ ہے (ہمزہ کے ساتھ) اس کے معنی ہیں چھٹکارا۔ شبِ برأت کے معنی ہوئے گناہوں سے چھٹکارے کی رات۔ جب کہ برات فارسی کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں حصہ، روزی، قسمت۔ (برات کے معنی شادی یا شادی کا جلوس بھی ہیں۔ اس لفظ کو بارات بولنا یا لکھنا صحیح نہیں)۔

یہ تھا مشتے نمونہ از خروارے۔ لیکن یہ تو پوری کتاب اس قابل ہے کہ نقل کر دی جائے۔ افسوس کہ یہ ممکن نہیں۔ مناسب یہی ہوگا کہ آپ یہ کتاب حاصل کریں اور اس سے استفادہ کریں۔ طالب علموں اور صحافیوں کے لیے انمول تحفہ ہے۔

OOO

الفاظ کی سرگذشت

آج ہم ایک ایسی کتاب کا تعارف کرانا چاہتے ہیں جو بہت منفرد اور مختلف ہے۔ نام ہے اس کا ''سرگذشتِ الفاظ'' اور اس کے مصنف ہیں احمد دین۔

یہ کتاب منفرد اور مختلف اس لیے ہے کہ اردو میں اس نوع کی کوئی اور کتاب شاید ہی ہو۔ اس کا موضوع نہایت دلچسپ اور اچھوتا ہے۔ اس میں جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے الفاظ کی اصل کی تحقیق کی گئی ہے اور اردو، عربی اور فارسی کے کئی الفاظ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ کیسے بنے اور کیوں بنے۔ کئی الفاظ کے پیچھے کوئی دلچسپ واقعہ یا خوب صورت بات بھی چھپی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی لفظ کوئی استعارہ یا علامت ہوتا ہے لیکن کثرتِ استعمال سے معنی کھو بیٹھتا ہے۔ مصنف نے اپنی تحقیق سے ان باتوں کا کھوج لگایا ہے۔

ہمارے پیشِ نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو لاہور سے ۱۹۶۹ء میں طبع ہوا، اگرچہ اس ایڈیشن میں کتابت کی خاصی اغلاط ہیں لیکن پھر بھی غنیمت ہے۔ کیوں کہ پہلا ایڈیشن نایاب ہو چکا ہے۔ مصنف نے اس امر کی وضاحت ابتدا ہی میں کر دی ہے کہ یہ کتاب دراصل انگریزی کی ایک کتاب کی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ ایک ''مشفق'' دوست نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ اصل میں یہ کتاب پادری ٹرینچ کی انگریزی کتاب

"Study of wrods" سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ البتہ اصل کتاب میں انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں اور احمد دین صاحب نے ان کی جگہ اردو، فارسی، عربی اور ہندی الفاظ کو لے لیا ہے۔ احمد دین صاحب وکیل تھے اورادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ان کی ایک اور کتاب اقبال پر ہے جو چھپی تو اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ بہرحال، یہ تو ایک الگ قصہ ہے۔ فی الحال ''سرگذشتِ الفاظ'' کی بات کرتے ہیں۔

پہلے باب میں مصنف نے الفاظ کو متحجّر نازک خیالی قرار دیا ہے۔ گویا الفاظ ایسی قدیم چٹانیں ہیں جن میں ہزاروں سال پرانے جانداروں کے آثار جمے پڑے ہیں اور انھیں کھود کر، ان پر تحقیق کر کے تاریخی شواہد کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ الفاظ کو متحجرہ (اسے انگریزی میں Fossil کہتے ہیں) سے تشبیہہ دے کر مصنف نے بہت خوب صورتی سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے اور پھر اسے ثابت بھی کیا ہے۔ اگلے ابواب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ الفاظ کس طرح کسی قوم کا مذہب، اخلاق، تمدن، اور اس کی تاریخ بتا دیتے ہیں۔

اس کتاب سے چند جواہر آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

برباد

لفظ برباد کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے کہا ہے کہ جس کسی نے یہ لفظ پہلے پہل استعمال کیا ہوگا اس نے بہت دفعہ آندھی اور ہوا کو کسی چیز کی خاک اڑاتے دیکھا ہوگا۔ اور جس چیز کی خاک ''باد'' یعنی ہوا اڑا دے پھر اس کا نام ونشان تک مٹ جاتا ہے۔

یہاں ہم اتنی وضاحت کی جسارت کریں گے کہ برباد اصل میں ''خاک برباد'' کی مختصر صورت ہے۔ ''بر'' کے فارسی میں معنی ہیں ''پر۔'' ''خاک برباد'' بھی لکھا اور بولا جاتا ہے جس کے لفظی معنی ہیں: ''جس کی خاک ہوا پر ہو۔'' یعنی جو ایسا تباہ ہو کہ اس کی مٹی بھی ہوا کے دوش پر اڑتی پھرتی ہو۔ اب بتایئے کہ لفظوں میں مصوری کا مزہ آیا یا نہیں؟

زلیخا

عربی میں زلخ کے معنی ہیں پاؤں پھسلنا۔ اسی مناسبت سے زلیخا نام رکھ دیا

گویا یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

تہذیب

عربی میں تہذیب کے معنی ہیں: ''کھجور کے درخت سے چھال صاف کرنا''
اس سے مراد ہے صاف ستھرا کرنا، عیب دور کرنا۔ اور جب انسان تعلیم اور تربیت کے
ذریعے صاف ستھرا ہو جائے اور اپنے نفس سے عیب دور کر دے تو یقیناً وہ ''مہذب''
کہلانے کا حق دار ہو جاتا ہے۔

سہل

عربی میں ''سہل'' کے معنی ہیں چٹیل میدان۔ چوں کہ چٹیل میدان میں کوئی
رکاوٹ نہیں ہوتی اور اس میں چلنا، دوڑنا اور پھرنا آسان ہوتا ہے، لہٰذا ''سہل'' آسان
کے معنوں میں رائج ہو گیا۔

عجم

عجم کے لفظی معنی ہیں ''گونگا''۔ عربوں نے جب ایران فتح کیا تو ایرانیوں کو
عجمی یا گونگا قرار دے دیا۔ شاید اس لیے کہ بے چارے عربی سے ناواقف ہونے کی بنا پر
خاموش رہتے ہوں گے یا فاتحین کے رعب سے چپ رہتے ہوں گے۔ ایک وجہ یہ بھی
بیان کی جاتی ہے کہ عرب اپنی زبان کو اتنا فصیح اور بلیغ سمجھتے تھے کہ اس کے سامنے باقی
زبانیں انھیں غیر فصیح اور نادار معلوم ہوتی تھیں۔ اور ان کے نزدیک دوسری زبانیں مفہوم
کو (عربی کے برخلاف) عمدگی سے ادا نہ کرنے کی بنا پر گونگی تھیں۔ رفتہ رفتہ عجم اور عجمی کا
اطلاق نہ صرف ایران بلکہ تمام غیر عرب اقوام پر ہونے لگا۔

تحریر

اس لفظ پر ہمیں یاد آیا کہ ایک بار اردو کے ایک پروفیسر صاحب نے
یونیورسٹی میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تحریر کا لفظ ''آزادی'' کا
مفہوم رکھتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ جب ہم کوئی بات یا خیال تحریر کرتے ہیں تو گویا

اس کو اپنے دماغ سے نکال کر آزاد کر دیتے ہیں۔ ہم بھی وہیں موجود تھے۔ بات کچھ عجیب سی لگی لیکن کم علمی کی وجہ سے چپ رہے۔

''سرگذشت الفاظ'' پڑھتے ہوئے یہ لفظ سامنے آیا تو ان کی یہ بات یاد آ گئی۔ اگرچہ انھوں نے یہ توضیح فرمایا تھا کہ تحریر کا لفظ آزادی کا مفہوم رکھتا ہے لیکن اس کی وجہ تسمیہ کچھ اور ہے۔ بقول احمد دین صاحب کے، قدیم زمانے میں کسی غلام کو جب آزاد کیا جاتا تھا تو اس کو ایک پروانۂ آزادی لکھ کر دے دیا جاتا تھا۔ اسے تحریر یعنی ''آزاد'' کرنا کہتے تھے۔ اسی سے تحریر اور لکھنا ہم معنی ہو گئے۔

عربی کی لغت سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ عربی میں حرر یا تحرر کے معنی ہیں آزاد کرنا۔ اسی سے لفظ حرّیت یعنی آزادی بنا ہے۔ حُر اور احرار اسی خاندان کے فرد ہیں۔ عربی میں محرَّر کے معنی ہیں آزاد کیا ہوا۔ اردو میں اب محرِّر ''لکھنے والا'' کے معنوں میں آتا ہے اور زیادہ تر تھانوں تک محدود ہو گیا ہے جہاں ''ہیڈ محرِّر'' ہوا کرتا ہے۔

پھول اور تیجا

مصنف نے لکھا ہے کہ زبان کسی بھی قوم کے اخلاق و عادات، تاریخ اور رسم و رواج کی بھی عکاس ہوتی ہے۔ اس ضمن میں لفظ پھول پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وفات کے تیسرے روز ''تیجے'' کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم کو پھول بھی کہتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہندو اپنے مُردوں کو جلانے کے بعد ان کی ہڈیاں تیسرے روز گنگا میں ڈالتے تھے۔ مرے ہوئے لوگوں کی اِن جلی ہوئی ہڈیوں کو پھول کہتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے اپنے گمراہ کن مذہبی عقائد کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں اور تقریبات میں باہمی مطابقت اور یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی (ہماری ذاتی رائے میں اس کی وجوہ سیاسی بھی ہوں گی) اور اسی غرض سے یہ رسم ہندوؤں سے لے لی گئی اور اس کا نام پھول رکھا گیا۔ آج بھی تیجے یا سوئم کی رسم ہماری تاریخ اور تمدن کی اس بوالعجبی کی یاد دلاتی ہے جسے اکبر کے ایجاد کردہ ''دینِ الٰہی'' کی صورت میں تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے۔

''شکریہ'' اور ''قتل'' کے لیے لفظ

زبان پر تہذیب و تمدن اور اخلاق کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ برازیل کی دو زبانیں ایسی ہیں جن میں شکریہ ادا کرنے کے لیے کوئی لفظ نہیں ملتا۔ اسی طرح نیوزی لینڈ کی ایک قبائلی زبان میں قتل کا مفہوم ادا کرنے کے لیے تو چار الفاظ ہیں جو قتل کی نوعیت پر مختلف انداز سے روشنی ڈالتے ہیں لیکن محبت کے لیے کوئی لفظ نہیں ملتا جس سے ان قبائلیوں کی خوبیوں کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ (غالباً یہ بہت قدیم زمانے کا ذکر ہے۔ آج کے دور میں تو نیوزی لینڈ کے قبائلی اور اُن کی زبانیں بھی عنقا ہو چکی ہوں گی) ایک پادری صاحب نے اپنی کتاب میں جنوبی افریقا کے وحشیوں کی زبان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں ایک لفظ ''ماریمو'' استعمال ہوتا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ''وہ جو اوپر ہے۔'' اصل میں یہ نام یہ وحشی کسی زمانے میں خالقِ کائنات کے لیے استعمال کیا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس کا استعمال محدود ہو گیا اور صرف بڑے بوڑھے ہی اس سے واقف تھے، نئی نسل اسے محض جنتر منتر اور ٹوٹکوں کے وقت استعمال کرتی تھی۔

☆

اس پر ہمیں خیال آیا کہ ہر زبان میں کچھ ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو اس خطے کے تہذیب و تمدن اور معاشرتی تصورات کو آشکارا کرتے ہیں۔ غیر قوم یا دوسرے کلچر کے لوگ ان کے لیے کوئی لفظ یا کوئی مترادف اپنے ہاں نہیں رکھتے اور اگر کوئی لفظ ہوتا بھی ہے تو اس مفہوم کو صحیح طور پر ادا نہیں کرتا۔ مثلاً فرانسیسی اور جرمن زبان میں بعض تہذیبی تصورات کے لیے جو لفظ ملتے ہیں ان کا ٹھیک انگریزی مترادف دستیاب نہیں ہوتا اور ان کی وضاحت میں ایک دو سطریں لکھنی پڑتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ محض لفظ نہیں ہوتے بلکہ ''تصورات'' اور ''خیالات'' ہوتے ہیں۔ اس کی مثال کے طور پر لفظ ''عصمت'' کو لیجیے، ہمارے ہاں عصمت و عفت کا جو تصور ہے وہ مغربی تہذیب میں ناپید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے جو لفظ ملتے ہیں (مثلاً Pruity, Modesty, Chastity, Integrity وغیرہ) وہ اس کے اصل مفہوم کو

اور عصمت کے تصور کو صحیح معنوں میں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ کچھ یہی کیفیت ہماری اشیائے خوردو نوش اور رسوم و رواج کی ہے۔ مثلاً پان کو لیجیے، پان کے آپ لاکھ ترجمے کر لیجیے، اس کے لوازمات، خصوصیات اور اہمیت پر انگریزی میں ایک مضمون لکھ ڈالیے، لیکن جس انگریز نے زندگی بھر کبھی پان نہیں کھایا وہ خاک بھی نہیں سمجھے گا کہ پان ہوتا کیا ہے۔ ہاں اسے ایک عدد گلوری، سونف خوش بو اور مشکی قوام والے پان کی کھلا دیجیے اور پھر قدرت کا تماشا دیکھیے۔ ان شاء اللہ دریائے ٹیمز کی ڈھلی ہوئی انگریزی میں پان پر لیکچر دے گا اور پھر لکھنوی لہجے میں آداب و تسلیمات کے بعد اسے بیٹل لیف (Betel Leaf) کی بجائے پان (Paan) کہنے پر اصرار کرے گا۔ (اگر بے ہوش نہ ہوا ہوگا تو!) کیوں کہ پان محض کھانے کی چیز نہیں ایک تہذیب کا نام ہے۔

OOO

ہماری سماجی صورتِ حال اور زوالِ مشرق

گو امریکی ذرائع ابلاغ ایک محدود سوچ اور مخصوص مفادات کے تابع ہیں لیکن کبھی کبھار ان کے حوالے سے ایسی معلومات میسر آجاتی ہیں جو بہت اہم ہوتی ہیں اور کبھی کبھی ہماری سوچ کو بھی بیدار کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

اللہ رکھے ہماری قومی زبان کے رسائل و اخبارات کو جو غیر ملکی جرائد اور مطبوعات سے دل کھول کر خبریں، مضامین اور تصاویر چوری کرتے ہیں اور حوالہ تک نہیں دیتے لیکن تاڑنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ کون سا اخبار آج کل کس رسالے سے تصاویر اور رپوٹیں چرا رہا ہے اور کون سا رسالہ بغیر سوچے سمجھے مضامین کے الٹے سیدھے ترجے چھاپ رہا ہے۔ زیادہ افسوس اس وقت ہوتا ہے جب فکر انگیز اور کار آمد مضامین کو چھوڑ کر ہالی وڈ کی اداکاراؤں پر لکھے گئے مواد کو (چوری ہی کی) رنگین تصاویر کے ساتھ چھاپ دیا جاتا ہے۔

حال ہی میں امریکی ہفت روزے ''ٹائم'' نے ایک بہت فکر انگیز مضمون شائع کیا ہے۔ یہ مضمون مشرق کے فکر و فلسفے سے متعلق ہے۔ اس میں ایشیا کے زوال اور مغرب پر اس کے انحصار کو مشرقی فکر اور فلسفے سے جوڑا گیا ہے۔ یہ فکر انگیز مضمون ہمیں بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتا ہے اور شاید اسی لیے ابھی تک اسے چوری نہیں کیا گیا۔ کیوں کہ ہم

بحیثیت قوم تفکر کی عادت سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔ تفلسف کی جگہ کرکٹ نے لے لی ہے۔ ہر شخص کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ کہیں ہم ورلڈ کپ کرکٹ میں ہار نہ جائیں۔ کوئی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتا کہ ہمارے دشمن ہماری تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی اقدار کو شکست دینے کے لیے کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ہماری قومی شناخت اور ہمارے لسانی تشخص کو مٹانے کے لیے کیسی تیاریاں جاری ہیں، بلکہ ہمارے ملک اور قوم ہی کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے کیسے کیسے منصوبے بن رہے ہیں۔ اس کا کسی کو غم نہیں۔ پریشانی ہے تو یہ کہ ہم ورلڈ کپ کے فائنل میں پہنچیں گے یا نہیں؟ ''ٹائم'' کا یہ شمارہ آئے خاصا عرصہ ہو گیا ہے لیکن اس مضمون کے مشمولات سے ہمارا ذہن ابھی تک آزاد نہیں ہو سکا ہے۔ ادھر کوئی اسے ترجمہ کر کے بھی نہیں چھاپ رہا۔ لہٰذا اس مضمون کے کچھ اہم نکات ہم اپنے قارئین کے لیے خلاصے کے طور پر پیش کر رہے ہیں تا کہ یہ زوال پذیر قوم اپنے اور مشرق کے زوال پر سوچے اور پھر اپنی سماجی اور ادبی صورت حال کو بھی اسی تناظر میں دیکھے۔

سن منگ شا نامی کوئی صاحب ہیں جنھوں نے یہ مضمون لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ آج سے ہزار برس پہلے چینی قوم دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اقوام میں سے تھی۔ بلکہ تین سو برس پہلے بھی اس کا ذکر اپنی ہم رتبہ قوموں میں سب سے پہلے ہوتا تھا۔ لیکن گذشتہ سو برسوں میں مغرب نے مشرق پر برتری حاصل کر لی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کسی قوم کا ایسا ڈرامائی زوال کبھی نہیں ہوا۔

یہاں بحث معاشی ترقی یا انجینئرنگ کی مہارت کی نہیں اس میں تو ایشیا آج بھی آگے ہے۔ بات یہاں ہو رہی ہے اس ذہنی اُپج اور تخلیقی سوچ کی جس کے نتائج بنی نوع انسان کی مجموعی ترقی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آج چین اور جاپان دنیا کی بہترین اور اعلیٰ ترین سائنسی ٹیکنالوجی کے حامل ہیں لیکن اس ترقی کی بنیاد نیوٹنی طبعیات (Newtonian Physics) اور مقداری میکانیات (Quantum Mechanics) پر رکھی گئی ہے اور یہ دونوں خالصتاً مغربی فکر کی دین ہیں۔

آگے چل کر مضمون نگار کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ایشیائی اقوام مغربی تہذیب اور مغربی فکر کی خوشہ چین ہوگئی ہیں بلکہ ایشیائی ذہن مغرب میں جا کر خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ کئی ایسے ایشیائی باشندوں نے نوبل انعام جیتے ہیں جو امریکا میں رہتے اور کام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرق میں ذہنی آزادی نہیں ہے۔ بعض ایشیائیوں کا کہنا ہے کہ انھیں ایشیا چھوڑنا ہی اس لیے پڑا کہ وہاں کی دانشورانہ فضا میں گھٹن زیادہ ہے اور اس گھٹن کی وجہ یہ ہے کہ ایشیا میں بزرگی کو ذہانت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ وہاں کے تعلیمی نظام نے اذہان میں یہ بٹھا دیا ہے کہ استادوں، والدین اور سیاسی قائدین کی ہر بات درست ہوتی ہے اور وہی بہتر علم رکھتے ہیں۔ ایشیا کے بعض اعلیٰ افسران اور سیاسی لیڈر ان خواجہ سراؤں کی طرح ہوتے ہیں جو ماضی کی عظیم بادشاہتوں میں پائے جاتے تھے۔ یہ خواجہ سرا اور یہ اعلیٰ افسر نااہل اور احتساب سے بالاتر ہوا کرتے ہیں۔

ایشیا میں ماضی میں حصولِ علم کا مطلب ہوتا تھا کہ کوئی ایسا امتحان پاس کیا جائے جس سے سرکاری ملازمت کا حصول یقینی ہوجائے تاکہ معقول آمدنی جاری رہ سکے۔ آج بھی ایشیائی معاشرے میں علم کا حصول برائے علم نہیں ہوتا۔ چین کے فلسفی کنفیوشس کی تعلیمات میں زور اس بات پر بھی تھا کہ اپنے بڑوں کی حکم عدولی کسی طور نہ کی جائے۔ ان دو باتوں (یعنی علم برائے ملازمت اور تعمیلِ حکم) نے ایک ایسی ذہنیت پیدا کر دی جس میں تخلیقی رویہ ناپید تھا، اور اس سے ذہنی اور علمی ترقی رک گئی۔

وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ دنیا میں جتنی بھی ذہنی، علمی اور سائنسی ترقی ہوتی ہے اس کی بنیاد اُس وقت تک موجود تمام علم کی نفی یا جزوی نفی پر ہوتی ہے۔ جب کہ مشرقی فلسفہ بزرگوں اور پُرکھوں کی عقل، علم اور تجربات کی نفی سے روکتا ہے، اور کسی سوچ یا نظام کی بغیر سوچے سمجھے پابندی کرنا تخلیقی فکر اور ذہنی ترقی کی ضد ہے۔

اختلافی سوچ کو برداشت کرنا صرف سیاسی جمہوریت کی بات نہیں، یہ تخلیقی سوچ کی بنیاد بھی ہے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ اگر کسی معاشرے میں آزاد سوچ اور اختلافات کو پھلنے پھولنے دیا جائے تو دانش وروں کے کوڑے میں سے کوئی گوہرِ نایاب

نکل سکتا ہے۔ صرف چند بڑے نظریات دنیا کو بدلنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ لیکن مشرق میں چوں کہ اختلاف رائے کو پسند نہیں کیا جاتا اور بڑوں کی باتوں کو اہمیت دی جاتی ہے لہٰذا کئی نوجوان گوہرِ نایاب اپنے بڑے نظریات کے باوجود دنیا کو یا معاشرے کو بدل نہیں سکتے، ترقی کی نئی راہ نہیں کھول پاتے۔ نتیجتاً مشرق نئے خیالات اور ترقی کی نئی راہوں کے لیے مغرب کا محتاج ہے۔ صاحبِ مضمون کا خیال ہے کہ اس خرابی کی ایک وجہ مشرق کا تعلیمی نظام بھی ہے جو سوچنے کی بجائے رٹنا سکھاتا ہے۔

اب آیئے ذرا اس ایشیا کے زوال یا مشرق کی پستی کا جائزہ ہم اپنے ملک، اپنے سماج اور اپنے ادب کے تناظر میں لیں۔

وطنِ عزیز کے تعلیمی اداروں کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایم بی بی ایس کا طالب علم بھی نقل کر کے پاس ہوجاتا ہے اور جب ڈاکٹر بن کر نکلتا ہے تو کیا آفت ڈھاتا ہے اس کا سب کو علم ہے۔ گویا ایشیا کے بقیہ تعلیمی ادارے غالباً رٹنا سکھاتے ہوں گے، ہمارا طالب علم تو رٹنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ "سوچنے" جیسا جان لیوا کام کرنے کو کب تیار ہوگا۔

ہمارے سرکاری اداروں میں پائے جانے والے اعلیٰ افسران کی نااہلی کا موازنہ بقیہ ایشیائی افسران سے کیا جائے تو صورت حال زیادہ الم ناک نظر آتی ہے۔ ہمارا افسر نااہل ہی نہیں بدعنوان اور بدکردار بھی ہے۔ نتیجہ یہ کہ مشرق یا ایشیا تو مغرب کا دست نگر ہے اور ہم ایشیا کے بھی دست نگر اور محتاج ہیں۔ چین اور جاپان مغربی فکر اور مغربی تہذیب سے خوشہ چینی کرتے ہوں گے، نیوٹن کی طبیعیات کے اصولوں یا مقداری میکانیات سے فائدہ اٹھا کر کچھ نئی چیزیں بنالیتے ہوں گے، ہم تو انھی چینیوں اور جاپانیوں سے مدد کی بھیک مانگتے ہیں۔

سائنس ہو یا ادب، تہذیب ہو یا زبان، ہم ہر معاملے میں پچھڑے ہوئے ہیں، پس ماندہ، نقال اور بِھک منگے ہیں۔ ہمارے ذرائع ابلاغ باہر سے چیزیں چوری کر کے بغیر حوالے کے چھاپ دیتے ہیں، ہمارا صنعت کار باہر کی چیزوں کی نقل اور نہایت گھٹیا

نقل تیار کرتا ہے، ہمارا ٹی وی اپنی زبان اور تہذیب چھوڑ کر غیروں کی اداؤں پر فدا ہے اور ہو بہو ان جیسا بن جانا چاہتا ہے اور اپنی زبان کا حلیہ بگاڑنے میں پیش پیش ہے، ہمارا ادیب غیر ملکی ادب اور فلسفے کے حوالے دیے بغیر لقمہ نہیں توڑتا، لیکن درحقیقت ان کا اس نے سطحی سا مطالعہ کیا ہوتا ہے اور اس کا بھرم رکھنے کے لیے انگریزی کے الفاظ بڑے فخر سے اردو تحریر میں سجاتا ہے۔ گو انگریزی میں چند جملے بھی صحیح نہیں لکھ پاتا۔ ہماری حکومت جمعہ کی تعطیل ختم کر کے برآمدات بڑھانے کا دعوئ کرتی ہے لیکن غیروں کی فرماں برداری کا نتیجہ معیشت کی تباہی اور برآمدات میں کمی کی صورت میں نکلتا ہے۔

ہم نے سوچ کے دروازے بند کردیے ہیں، ہم نے تحقیق سے منہ چھپالیا ہے، ہماری یونی ورسٹیوں میں جو لوگ صدرِ شعبہ ہوتے ہیں وہ تحقیق کی بجائے پبلسٹی اور پبلک ریلیشنگ میں مصروف رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے ماتحت ان سے زیادہ پڑھے لکھے، زیادہ قابل اور زیادہ محنتی ہوتے ہیں لیکن انھیں کوئی اوپر نہیں آنے دیتا، کیوں کہ بقول ہمارے مضمون نگار دوست کے مشرق میں بزرگی کو ذہانت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں علم اور تحقیق پر عمر اور حکمرانی حاوی ہیں۔

مغربی ممالک میں اگر کسی یونی ورسٹی کا استاد پڑھنا لکھنا چھوڑ دے، کوئی تازہ تحقیق پیش نہ کرے تو اسے پڑھانے سے ہٹا کر دفتری کاموں پر لگا دیا جاتا ہے۔ بوڑھا پروفیسر اگر علم وتفکر سے دور رہے تو عین ممکن ہے کہ اس کے شعبے کی سربراہی کوئی ایسا نوجوان استاد کررہا ہو جس کے شب و روز کتابوں میں بسر ہوتے ہیں۔

وطن عزیز میں جو جتنا بوڑھا پروفیسر ہے وہ اتنے ہی نوجوان جواہرِ نایاب کی قسمتوں پر مہر لگائے بیٹھا رہے گا اور تحقیق تو دور کی بات ہے، پچیس سال پہلے جن نوٹس (notes) کو پڑھ کر ایم اے یا ایم ایس سی کیا ہوگا آج تک انھی نوٹس کی مدد سے پڑھا رہا ہوگا۔ سرکاری دفتروں کا بھی یہی عالم ہے۔ یادش بخیر کے ڈی اے میں ایک نوجوان انجینئر فضل الرحمان ہوا کرتا تھا جس کے تعمیراتی منصوبے اور تحقیقی خیالات سن کر کیا بڑے افسر کیا چھوٹے سب ہنسا کرتے تھے۔ تنگ آ کر وہ (جو اپنے افسروں سے زیادہ پڑھا لکھا

تھا مگر کم عمر تھا اور ''سوچا'' کرتا تھا) امریکا چلا گیا۔ وہاں ایک انجینئرنگ کمپنی نے اسے رکھ لیا۔ جب اس ادارے نے شکاگو میں دنیا کی بلند ترین عمارت سیئرز ٹاورز (یہ اب بلند ترین نہیں رہی کیوں کہ اس سے بھی بلند عمارت ملائیشیا میں بن چکی ہے لیکن اس وقت یہ دنیا کی بلند ترین عمارت ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ سے بھی اونچی بنی تھی) بنانے کا کام شروع کیا تو اس کی تکنیکی، فنی تفصیلات کا کام اسی پاکستانی کے ذمے تھا جس پر اس کے ہم وطن بالادست ہنسا کرتے تھے، اور اس نے بلند عمارات کی تعمیر کے لیے جو تکنیک نکالی وہ آج بھی استعمال ہوتی ہے۔

جس ملک کی یونی ورسٹیوں کا یہ عالم ہو کہ وہاں استاد تحقیق و تفکر کو فروغ دینے کی بجائے شعبہ جاتی سیاست، لسانی سیاست اور ملکی سیاست میں پڑے ہوئے ہوں اس ملک کے زوال کی انتہا کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

کچھ ایسی ہی صورت حال ہمارے ادب میں بھی درپیش ہے۔ لیکن اب ہم اس کی تفصیل میں اس لیے نہیں جارہے کہ ہم خود ایک عمر رسیدہ، کھوسٹ اور خرانٹ قسم کے بوڑھے ہیں۔ ہم خود بہت سی چیزوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ ہم بھلا اس صورت حال کو کیوں بدلنا چاہیں گے۔ کان کھول کر سن رکھیے کہ بڈھے بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔

اور ہاں اس مضمون نگار بھائی سن منگ شا نے آخر میں ایک بات کہی ہے کہ ایشیا اس پستی سے نکل سکتا ہے اور اس ترقی کی قیادت کچھ ملک کر سکتے ہیں۔ وہ کون سے ایشیائی ممالک ہیں اور پستی سے مشرق کیسے نکل سکتا ہے؟ یہ جاننے کے لیے اصل مضمون پڑھیے۔

یا پھر دعا کیجیے کہ اللہ کا کوئی نیک بندہ اس مضمون یا اس جیسی کارآمد تحریروں کا ترجمہ کرنا شروع کر دے۔ لیکن اس قوم کو کرکٹ، کیبل ٹی وی، ڈش انٹینا اور فلمی رسالوں سے فرصت ملے تو ایسا کوئی کام کیا جائے۔

○○○

لوگ کتابیں کیوں نہیں پڑھتے؟

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "آبِ گم" کا تازہ ایڈیشن مارکیٹ میں آگیا ہے۔
بڑی خوشی کی بات ہے کہ علم و ادب کی اس کساد بازاری کے دور میں کتابیں چھپ رہی ہیں بلکہ ان کی اشاعتِ ثانی یا ثالث کی نیک ساعت دیکھنی بھی نصیب ہورہی ہے۔

کون کہتا ہے کہ لوگ کتابیں نہیں پڑھتے؟ کون کہتا ہے کتابوں کی فروخت نہ ہونے کے برابر ہے؟ کون کہتا ہے کہ کتاب چھاپنا گھاٹے کا سودا ہے؟ بے شک اگر لکھنے والا یوسفی جیسا ہو تو کتاب بکتی ہے، کئی کئی اشاعتیں (Reprints) بھی ہاتھوں ہاتھ نکل جاتی ہیں۔ لیکن مصنف اگر ذرا بھی بقول شخصے "ماٹھا" ہے تو کتاب پٹ جائے گی اور برسوں گودام میں پڑی رہے گی۔ یوسفی یا تارڑ کی کتابوں کے کئی ایڈیشن نکل جاتے ہیں، ابن انشا کی بعض کتابوں کے بیس بیس ایڈیشن چھپ چکے ہیں، "شہاب نامہ" بھی غالباً اتنی ہی بار چھپ چکی ہے، مختار مسعود کی کتابوں کے بھی تازہ ایڈیشن بازار میں آگئے ہیں۔

اس کا مطلب ہے کہ لوگ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن شرطیں دو ہیں:

۱۔ کتاب اچھی ہو۔

۲۔ قیمت کم ہو۔

بلکہ اگر لکھنے والا یوسفی جیسا دھانسو ہو تو تین سو روپے کی کتاب بھی بک جاتی

ہے کو ذرا دیر سے اور رک رک کر، لیکن ناشر کی جیب تو بھر جاتی ہے۔

اب یوسفی کی اس کتاب ''آبِ گم'' ہی کو لیجیے۔ فروری ۱۹۹۰ء میں اس کا پہلا ایڈیشن آیا تھا۔ اس وقت اس کی قیمت ایک سو پچاس روپے تھی۔ آج اسی ایڈیشن کی بنیاد پر یعنی اسی کتابت اور انہی پلیٹوں کی مدد سے اسے دوبارہ چھاپا گیا ہے اور کاغذ پہلے کے مقابلے میں گھٹیا لگا ہے لیکن قیمت تین سو روپے رکھی گئی ہے۔

مہنگائی، بے روزگاری اور معاشی افراتفری کے اس دور میں جب کتاب خریدنا استطاعت سے باہر ہوتا جارہا ہو اور ٹی وی، کرکٹ میچ، ڈش انٹینا، انٹرنیٹ وغیرہ کی دلچسپیاں قارئین کے دامنِ توجہ کو کھینچ رہی ہوں تو کتابوں کی قیمت ظالمانہ حد تک بڑھا دینا صرف زیادتی نہیں باقاعدہ جرم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ قانونی جرم نہ ہو لیکن اخلاقی جرم تو ہے ہی۔

جو شخص پڑھنا چاہتا ہے اسے یہ خون آشام ناشر پڑھنے کیوں نہیں دیتے؟ کتابوں کی قیمت تین سو اور چار سو روپے کیوں رکھی جاتی ہے؟ بلکہ شاعروں (اور نثرنگاروں کی بھی) کلیات کی اشاعت کے رجحان نے ناشرین کے کاروبار کو چار چاند لگادیے ہیں۔ پانچ سو اور سات سو روپے فی جلد کے حساب سے یہ کلیات سرکاری لائبریریوں میں ملی بھگت کے نتیجے میں پہنچا دی جاتی ہیں جہاں کے باذوق چوہے اور پڑھے لکھے لال بیگ ان کی تقریبِ رونمائی منعقد کر کے ان کی پہلے گرد جھاڑتے ہیں اور پھر اس ''ادبِ عالیہ'' کو اس کے ''صحیح مقام'' تک پہنچا دیتے ہیں۔

پانچ سو روپے پر یاد آیا کہ بھائی عقیل عباس جعفری کی کتاب ''پاکستان کے سیاسی وڈیرے'' جب آئی تو اس کی قیمت پانچ سو روپے تھی۔ اس پر کسی نے تبصرہ کیا کہ ''اسے تو کوئی وڈیرہ ہی خرید سکتا ہے۔''

''آبِ گم'' کے مقابلے میں ''شہاب نامہ'' دوگنی بلکہ ڈھائی گنی ضخیم ہے اور قیمت دونوں کی برابر ہے۔ جب کہ مختار مسعود جو اپنی کتابیں بالعموم خود ہی شائع کرتے ہیں اپنی کتابوں پر شاید منافع لیتے ہی نہیں ہیں۔ اور جو قیمت ان کی کتاب پر درج ہوتی

ہے اس میں کتاب کی لاگت کے علاوہ صرف تقسیم کار اور کتب فروش کا منافع شامل ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں بالعموم ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہوتی ہے اور اس کی لاگت اکثر تیس چالیس روپے ہوتی ہے۔ بقیہ تمام (یعنی ڈیڑھ سو روپے کی کتاب میں سے ایک سو دس روپے) ناشر، تقسیم کار اور کتب فروش کا منافع ہوتا ہے۔

دورِ جدید کی سائنسی ترقیوں نے انسان کا سکون بھی چھین لیا ہے اور اس کے فرصت کے لمحات بھی۔ ہمارے ملک کے عام آدمی کی جیب مہنگائی نے خالی کر دی ہے۔ اب اگر کسی کے پاس فرصت کے لمحات ہیں بھی تو کتابوں کی مہنگائی اسے مطالعے سے باز رکھتی ہے۔ پھر ڈش انٹینا دیکھنے میں فائدہ یہ ہے کہ اس میں عقل بھی خرچ نہیں کرنی پڑتی۔ نہ سوچنا پڑتا ہے، نہ سمجھنے کو کچھ ہوتا ہے، بس بقول غالب:

عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

کا منظر ہوتا ہے بس اس مصرعے میں شمشیر کی بجائے کچھ نامحرموں کے نام رکھ دیجیے اور کتاب کو بھاڑ میں جانے دیجیے۔

ایک سیّد قاسم محمود بے چارے نے سستی کتابیں چھاپنا شروع کی تھیں اور ان کی کامیابی نے دوسرے ناشرین کو بھی یہی راہ سجھائی۔ قارئین نے ان سستی کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہمیں یاد ہے کہ ہم نے ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء کے لگ بھگ دو دو اور تین تین روپے کی کتابیں خریدی تھیں جو اسی سستی کتابوں کے سلسلے میں چھاپی گئی تھیں اور ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور ناشرین نے بھی ارزاں کتابیں چھاپنی شروع کی تھیں۔ البتہ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء تک کچھ مہنگائی ہوگئی تھی، لہٰذا بعض کتابیں چار اور پانچ روپے میں بھی لینی پڑیں۔ آج بھی اگر کوئی ناشر کمرِ ہمت کس لے اور بیس تیس روپے میں لوگوں کو کتابیں دینا شروع کرے تو شاید اکیسویں صدی میں ہماری قوم اَن پڑھ ترین قوموں میں شمار ہونے سے بچ جائے۔

کراچی میں صدر کے علاقے میں چھٹی کے روز فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں

خریدنے والوں کی تعداد دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں، خریدنے کو بھی تیار ہیں، بس ان کی جیب پر ڈاکا ڈالنے کا کام بند کردیا جائے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جو ناشرین سال میں چار بار ستر فی صد رعایت کے اعلان کے ساتھ کتاب میلے لگاتے ہیں انھیں اس ساری کھکھیڑ سے نجات مل جائے گی اور کتابیں بغیر کسی اشتہار بازی کے اور بغیر کسی ''حیرت انگیز'' رعایت کے بِک جایا کریں گی۔

پرانی کتابوں کی فروخت کے علاوہ بھی کچھ ایسی باتیں ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ لوگ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن ناشر انھیں پڑھنے نہیں دیتے۔ مثلاً ڈائجسٹوں کو لیجیے۔ خواتین کے ڈائجسٹ یا دوسرے ڈائجسٹ بالعموم تیس پینتیس روپے کے ہوتے ہیں اور قارئین کو لمبا چوڑا موادِ مطالعہ دیتے ہیں۔ ان کی فروخت روز افزوں ہے۔

صرف ''سب رنگ ڈائجسٹ'' ہی ایک لاکھ کے قریب فروخت ہوجاتا ہے۔ گو ان ڈائجسٹوں کی افادیت اور ان میں شائع ہونے والی تحریروں کی ادبی اور فنی حیثیت پر بہت کچھ اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ لوگ پڑھنا چاہتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ کوئی انھیں پڑھنے تو دے۔

○○○

اشاریہ

اشخاص

ادارے

کتب و منظومات

جرائد و رسائل

☆☆☆

مصنف کی دیگر کتابیں

تحقیق و تنقید

اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر

(انجمن ترقیِ اردو، کراچی، ۱۹۹۶ء)

طنز و مزاح

ہوائیاں

(فرید پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۲ء)

ترجمہ

سرخاب کے پر

(اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۱ء)

بچوں کے لیے

خفیہ پیغام

(فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۸ء)

پٹاخوں کا ہنگامہ

(مکتبۂ اردو ڈائجسٹ، لاہور، ۱۹۸۷ء)

نازک صاحب کا بکرا

(ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۴ء)

عبداللہ غوری
بُک کتب پراجیکٹ
مینجنگ ڈائریکٹر: حسنین سیالوی
گروپ میں شامل ہونے کے لیے واٹس ایپ کیجئے
03478848884

ہماری کتابیں

	کتب	مصنف	قیمت
۱۔	کلیاتِ یگانہ (شاعری)	مرتب: مشفق خواجہ	۵۰۰ روپے
۲۔	آئس لینڈ (سفرنامہ)	جمیل الدین عالی	۳۰۰ روپے
۳۔	موسم موسم (شعری کلیات)	ادا جعفری	۴۵۰ روپے
۴۔	آبلہ پا (ناول)	رضیہ فصیح احمد	۳۵۰ روپے
۵۔	چار ناول (ناول)	رضیہ فصیح احمد	۵۰۰ روپے
۶۔	ورثہ اور دوسری کہانیاں (افسانے)	رضیہ فصیح احمد	۲۰۰ روپے
۷۔	چاکِ قفس (شاعری)	رضیہ فصیح احمد	۱۵۰ روپے
۸۔	بیدار دل لوگ (خاکے)	شاہ محی الحق فاروقی	۲۰۰ روپے
۹۔	سلاس (ناول)	ترجمہ: انوار فاطمہ جعفری	۳۵۰ روپے
۱۰۔	عالمی ادب: ایک انتخاب (افسانے، شاعری)	شگفتہ افتخار	۱۵۰ روپے
۱۱۔	اختلاف کے پہلو (تنقید)	جمال پانی پتی	۱۸۰ روپے
۱۲۔	عالی کلام (جمیل الدین عالی کی شاعری کا انتخاب)	جمال پانی پتی	۲۰۰ روپے
۱۳۔	آشوبِ سندھ اور اردو فکشن (تنقید)	سیّد مظہر جمیل	۳۰۰ روپے
۱۴۔	دل درد سے خالی ہے (کالم)	ڈاکٹر طاہر مسعود	۲۵۰ روپے
۱۵۔	پلوں کے نیچے بہتا پانی (افسانے)	مقصود الٰہی شیخ	۲۸۰ روپے
۱۶۔	پس منظر (خود نوشت)	سیّد محمد سادات پوری	۴۵۰ روپے
۱۷۔	حصارِ امکاں (شاعری)	عبداللہ جاوید	۲۰۰ روپے
۱۸۔	آبشار (شاعری)	رضی مجتبیٰ	۲۵۰ روپے
۱۹۔	کہر میں ڈوبی شام (شاعری)	فراست رضوی	۱۵۰ روپے
۲۰۔	سرخاب کے پر (عالمی مزاح کے تراجم)	مترجم: ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۱۰۰ روپے
۲۱۔	مشرق و مغرب کے افسانے (عالمی ادب کے تراجم)	مترجم: حمرا خلیق	۱۵۰ روپے
۲۲۔	تنہائی کا ایک دن (افسانے)	شمیم منظر	۱۲۰ روپے
۲۳۔	بکھرے ہوئے لوگ (افسانے)	محسنہ جیلانی	۱۵۰ رو
۲۴۔	چہرہ نما (ادبی خاکے)	شاہد حنائی	۱۵۰ رو
۲۵۔	خاکہ نگری (خاکے)	اشفاق احمد ورک	۲۰۰ رو
۲۶۔	ادب اور ادبی مکالمے (اہم ادیبوں کے انٹرویز)	شفیع عقیل	۲۵۰ رو

عصری
اور
سماجی رُجحا